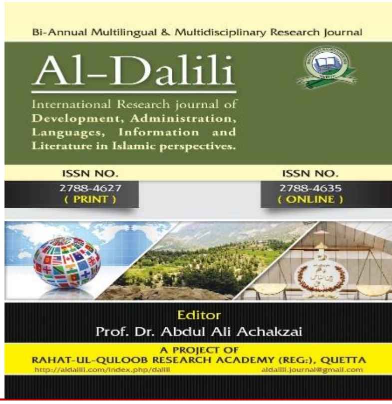

OPEN ACCESS

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

AL DALILI

Bi-Annual, Multilingual (Arabic, Balochi, Birahvi, English, Pashto, Persian,Urdu)

ISSN: 2788-4627 (Print), ISSN: 2788-4635 (online)

Project of **RAHATULQULOOB RESEARCH ACADEMY,**

Jamiat road, Khiljiabad, near Pak-Turk School, link Spini road, Quetta, Pakistan.

Website: www.aldalili.com

Approved by Higher Education Commission Pakistan

Indexing: » IRI (AIOU), Tahqeeqat, Euro pub, MIAR.

TOPIC

سفر نامہ افغانستان (تاریخ،مشاہدات، معلومات)

Travelogue of Afghanistan (History, Observations, Information)

AUTHOR

1. Dr. Syed Bacha Agha, Assistant Professor / HOD Islamic Studies, Government Postgraduate College, Saryab road, Quetta, Pakistan.
   Email: agha211179@gmail.com

How to Cite: Dr. Syed Bacha Agha. (2023). URDU: (سفر نامہ افغانستان(تاریخ،مشاہدات، معلومات: Travelogue of Afghanistan (History, Observations, Information). *Al-Dalili*, *4*(2), 79–110. Retrieved from https://aldalili.com/index.php/dalili/article/view/111

URL: https://aldalili.com/index.php/dalili/article/view/111

Vol. 4, No.2 || Jan–Jun 2023 || URDU-Page. 79-110

Published online: 16-02-2023

سفر نامہ افغانستان (تاریخ، مشاہدات، معلومات)

Travelogue of Afghanistan (History, Observations, Information)

سید باچا آغا

ABSTRACT:
Ever wanted to learn about a different country? Then, a travelogue may be the genre for you! Travelogues follow the protagonist as they embark on a trip either around their own country or somewhere new entirely. They are often humorous, but always informative and are an easy way to learn about far often places. However, it has been my hobby for a long time to travel often. This year I went on a tourist trip to Afghanistan. Seen different areas, got acquainted with their history and customs and made acquaintances and relationships with many new people.
Key words: travelogue, Afghanistan, observations, Information.

سیر وسیاحت کرنے والے سیار وسیاح کے مطابق قدرتی، شفاف، خوبصورت وپر فضا مقامات پر وقت گزارنے اور نئے نئے مقامات دیکھنے والے افراد کے جذباتی لگاؤ میں بہتری آتی ہے اور وہ زیادہ ہمدرد بن جاتے ہیں، وہ سماج اور وقت کی اہمیت کو بہتر سمجھنے لگتے ہیں، ان کا ذہن مسائل کو مختلف نظریے سے دیکھتا اور حل تلاش کرنے لگتا ہے۔ سیر وسیاحت اور سرسبز علاقوں کو دیکھنے کے مشغلے انسان کی ذہنی وجسمانی صحت پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ لوگ ایسے افراد کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس سے لوگوں کے سماجی رتبے میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ نئے ماحول کو دیکھنے اور مختلف زبانیں سننے اور بولنے جیسی دماغ کی نشوونما کرنے والی سرگرمیاں سرانجام دینے کا موقع ملتا ہے۔ سفر کرنے سے دماغ میں مختلف اور نئے تجربات اور ماحول سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ رویہ عمر بھر کے لیے اعصاب کی صحت اور لچک کو بڑھاتا ہے۔ تحقیق کے مطابق اگر آپ جوان ہیں اور کچھ عرصے کے لیے بیرون ملک منتقل ہوسکتے ہیں تو یہ تجربہ آپ کی ذاتی فروغ کو بہت فائدہ پہنچائے گا۔ محققین کا کہنا ہے 'لڑکپن سے جوانی میں داخل ہونے کے دوران زیادہ تر افراد باضمیر، سمجھدار اور جذباتی طور پر مستحکم ہو جاتے ہیں۔

زمین کے مختلف خطوں میں گذشتہ لوگوں کے جو نشانات قدیم ادوار سے باقی ہیں، وہ زندہ اسناد اور بولنے والی تاریخ ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ان کے متعلق لکھی ہوئی تاریخ کی نسبت ان سے زیادہ بہرہ ور ہوسکتے ہیں کیونکہ ان نشانات سے ہم ان اقوام کی جسمانی ساخت، ان کا زاویہ فکر اور ان کی قدرت وعظمت کو بآسانی جان سکتے ہیں جبکہ صفحات تاریخ صرف وقوع پذیر واقعات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ستمگروں کے محلات کی ویرانی، اہرام مصر کی تعجب خیز عمارتیں، بابل کے برج، کسریٰ کے محل، قوم سبا کے آثار تمدن اور اس طرح کی بیسوں نشانیاں جو اس عالم کے گذشتہ وکنار میں بکھری پڑی ہیں۔ اسی طرح اہل اللہ کے خانقاہیں، مساجد ومدارس، قدیمی تعمیرات ومنابر اور حکماء وسلاطین کے آخری آرام گاہیں ان میں سے ہر ایک نشانی زبان حال سے ان لوگوں کی تاریخ بیان کرتی ہے اور بے زبانی کی زبان میں باتیں کرتی ہے۔ یہ حقیقت اس وقت آشکار ہو جاتی ہے جب کوئی نکتہ سنج ان محلات کے خرابوں میں جا کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنی روح میں ایک اضطراب محسوس کرتا ہے اور ہیجان انگیز بول کہتا ہے، جیسا کہ خاقانی اور دوسرے عالمی شہرت یافتہ شعراء نے کسریٰ وغیرہ کے ٹوٹے پھوٹے محلات کے اندر سے یہ آوازیں دل کے کانوں سے سنی ہیں اور انہیں ادبی شاہکاروں کی زینت بنایا ہے۔ ان زندہ تاریخی آثار کا مطالعہ کرنا ضخیم تاریخی کتاب پڑھنے کے برابر ہے، یہ مطالعہ

انسان کی روحانی بیداری کے لئے ایک موئثر چیز ہے کیونکہ جب ہم ان آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اچانک ایسا لگتا ہے کہ ان ویرانوں میں زیر خاک بوسیدہ ہڈیاں زندہ ہو گئی ہیں اور پہلے جوش ولولہ کا مشاہدہ کر رہی ہیں لیکن جب ہم دوبارہ ان کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو انہیں خاموش فراموش شدہ دیکھتے ہیں۔ ان دو حالتوں کا موازنہ اس راز کو طشت از بام کرتا ہے کہ خود سر افراد کتنے کوتاہ نظر ہیں کہ جو بہت جلدی گذر جانے والی ہوس رانیوں کے لئے ہزارہا بدکاریوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لئے قرآن مجید حکم دیتا ہے کہ مسلمان روئے زمین پر سیر وسیاحت کریں اور گزشتہ لوگوں کے آثار کا مشاہدہ کر کے ان سے عبرت حاصل کریں۔ اسلام میں بھی جہاں گردی اور سیر و تفریح کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے لیکن آج کے ہوس پرست سیاحوں کی طرح نہیں بلکہ گذشتہ لوگوں کے آثار وانجام کے مطالعہ اور گوشہ ہائے عالم میں عظمت خدا کے مشاہدہ کے لئے اور اسی کا نام قرآن نے "سیروا فی الارض" رکھا ہے اور کئی ایک آیات میں اس کا حکم دیا ہے۔ مثلاً:

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَءَ الْخَلْقَ۔[1]

ترجمہ: کہو کہ زمین میں گھوم پھر کر دیکھو کہ خدا نے کیسے تخلیق کی۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا۔[2]

ترجمہ: کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں تاکہ ان کے دل اس سے کچھ عقل حاصل کرتے۔

یہ آیات کہتی ہے کہ یہ معنوی اور روحانی سیاحی اور زمین کی سیر انسان کے دل کو دانائی، آنکھوں کو بینائی اور کان کو سماعت عطا کرتی ہے اور اسے سکوت وجمود سے خلاصی دلاتی ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ اسلامی حکم و قانون بہت سے دیگر قوانین کی طرح طاق نسیاں کی نذر کر دیا گیا ہے۔ اب مسلمان اسے بھی نظر التفات سے نہیں دیکھتے یہاں تک کہ بعض علماء نے اپنی فکر کا دائرہ صرف گردوپیش تک محدود رکھا ہے۔ وہ گویا اس عالم کے علاوہ کسی اور عالم میں زندگی بسر کرتے ہیں اور دنیا کے اجتماعی انقلابات ووسائل سے بے خبر ہیں اور ان جزوی اور کم اثر کاموں میں اپنے آپ کو مشغول رکھا ہے جو اصولی اور بنیادی کاموں کے مقابلہ میں خاص قدر و قیمت نہیں رکھتے۔

بہر حال میرا ایک عرصے سے مشغلہ رہا ہے کہ اکثر سیر وسیاحت کے لئے نکلتا ہوں، پچھلے سال میں اپنے بچوں کے ہمراہ ایبٹ آباد، مانسہرہ، بالاکوٹ اور کشمیر گیا، خوب انجوائے کیا اور مختلف خیالات، آثار، رسوم ورواج اور تہذیب وتمدن سے آشنائی ہوئی۔ 2004ء سے (جب سے میں نے ملازمت اختیار کی ہے) اپنے استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلی اچکزئی صاحب کے ہمراہی سالانہ تعطیلات کے دوران کسی نہ کسی علاقے کی طرف سیر کو نکلتے ہیں، گویا اب یہ معمول بن گیا ہے۔ 2021ء میں جب ہم مکران ڈویژن کے سفر پر تھے تو راستے میں ہی ہم نے تہیہ کر لیا کہ اگلے سال افغانستان کو دیکھنے جائیں گے، اگرچہ 2022ء میں بوجوہ موقع نہ ملا چنانچہ اس سال (2023ء) ہم نے افغانستان کے سفر کے لئے عزم مصمم کیا۔

افغانستان، سرکاری طور پر امارتِ اسلامی افغانستان، وسط ایشیا اور جنوبی ایشیا میں واقع ایک زمین بند ملک ہے[3]۔ اس کے جنوب اور مشرق میں پاکستان، مغرب میں ایران، شمال مشرق میں چین، شمال میں ترکمانستان، ازبکستان اور تاجکستان ہیں۔ اردگرد کے تمام ممالک سے افغانستان کے تاریخی، مذہبی اور ثقافتی تعلق بہت گہرا ہے۔ یہ ملک بالترتیب ایرانیوں، یونانیوں، عربوں، ترکوں، منگولوں، انگریزوں، روسیوں اور امریکہ کے قبضے میں رہا ہے۔ مگر اس کے لوگ بیرونی قبضہ کے خلاف ہمیشہ مزاحمت کرتے رہے ہیں۔ ایک ملک کے طور پر

اٹھارویں صدی کے وسط میں احمد شاہ ابدالی کے دور میں یہ ابھرا اگرچہ بعد میں درانی سلطنت کے کافی حصے اردگرد کے ممالک کے حصے بن گئے۔ 1919ء میں شاہ امان اللہ خان کی قیادت میں انگریزوں سے افغانستان کی آزادی حاصل کی گئی جس کے بعد افغانستان صحیح معنوں میں ایک ملک بن گیا مگر انگریزوں کے دور میں اس کے بیشتر علاقے حقیقت میں آزاد ہی تھے اور برطانیہ کبھی اس پر مکمل قبضہ نہیں رکھ سکا۔ 11 ستمبر کے واقعے کو بنیاد بنا کر امریکہ نے طالبان پر جنگ مسلط کر دی اور طالبان حکومت (امارت اسلامیہ افغانستان) کو گرا دیا لیکن 20 سال بعد امریکہ کو طویل تباہ کن جنگ کے بعد افغانستان سے نکلنا پڑا۔ بظاہر امریکہ کی کٹھ پتلی حکومت (اسلامی جمہوریہ افغانستان کے نام سے) 15 اگست 2021 تک قائم رہی لیکن کابل پر طالبان کے قبضے کے ساتھ ہی اس حکومت کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا۔ افغانستان پچھلے پینتیس سال سے مسلسل جنگ کی سی حالت میں ہے جس نے اس کو تباہ کر دیا ہے اور اس کی کئی نسلوں کو بے گھر کر دیا ہے۔ یہ تباہی کبھی غیروں کے ہاتھوں ہوئی اور کبھی خانہ جنگی سے یہ صورت حال پیدا ہوئی۔ اگرچہ افغانستان کے پاس تیل یا دوسرے وسائل کی کمی ہے مگر اس کی جغرافیائی حیثیت ایسی ہے کہ وہ وسطی ایشیاء، جنوبی ایشیاء اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان میں ہے اور تینوں خطوں سے ہمیشہ اس کا نسلی، مذہبی اور ثقافتی تعلق رہا ہے اور جنگی لحاظ سے اور علاقے میں اپنا دباؤ رکھنے کے لیے ہمیشہ اہم رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استعماری طاقتوں نے ہمیشہ اس پر اپنا قبضہ یا اثر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ افغانستان کا زیادہ رقبہ پتھریلا پہاڑی علاقہ ہے اس وجہ سے کسی بھی بیرونی طاقت کا یہاں قبضہ رکھنا مشکل ہے اور لوگ زیادہ تر قبائلی اور پکے مسلمان ہیں اس لیے کبھی بھی بیرونی طاقتوں اور عالم کفر کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتے، نتیجہ یہ کہ اس ملک کو کبھی بھی لمبے عرصے کے لیے امن نصیب نہیں ہو سکا۔

افغانستان میں پچاس ہزار سال پہلے بھی انسانی آبادی موجود تھی اور اس کی زراعت بھی دنیا کی اولین زراعت میں شامل ہے[4]۔ سن 2000 قبل مسیح میں آریاؤں نے افغانستان کو تاراج کیا۔ پھر ایرانیوں نے ان سے چھین لیا۔ اس کے بعد یہ عرصہ تک سلطنت فارس کا حصہ رہا۔ 329 قبل مسیح میں اس کے کئی حصے ایرانیوں سے سکندر اعظم نے چھین لیے جس میں بلخ شامل ہے مگر یونانیوں کا یہ قبضہ زیادہ دیر نہ رہا۔ 642ء تک یہ علاقہ وقتاً فوقتاً ہنوں، منگولوں، ساسانیوں اور ایرانیوں کے پاس رہا۔ جس کے بعد اس علاقے کو مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ مسلمانوں کی اس فتح کو تاریخ میں عربوں کی فتح سمجھا جاتا ہے جو غلط ہے کیونکہ مسلمانوں میں کئی اقوام کے لوگ شامل تھے۔ اسلام سے پہلے یہاں کے لوگ بدھ مت اور کچھ قبائلی مذاہب کے پیروکار تھے۔

شہنشاہ بابر جس نے کابل کو دارالحکومت بنایا 642ء میں مسلمانوں نے اس علاقے کو فتح کیا مگر یہاں کے حکمران علاقائی لوگوں کو بنایا۔ پہلے یہ حکمرانی خراسانی عربوں کے پاس رہی، 998ء میں محمود غزنوی نے ان سے اقتدار چھین لیا۔ غوریوں نے 1146ء میں غزنویوں کو شکست دی اور انہیں غزنی کے علاقے تک محدود کر دیا۔ یہ سب مسلمان تھے مگر 1219ء میں چنگیز خانی منگولوں نے افغانستان کو تاراج کر دیا۔ ہرات، غزنی اور بلخ مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔ منگول بعد میں خود مسلمان ہو گئے حتیٰ کہ تیمور نے 14ویں صدی میں ایک عظیم سلطنت قائم کر لی۔ اسی کی اولاد سے شہنشاہ بابر نے کابل کو 16ویں صدی کے شروع میں پہلی دفعہ اپنا دارالحکومت قرار دیا 16 سے 18ویں صدی تک افغانستان کئی حصوں میں تقسیم رہا۔ شمالی حصہ پر ازبک، مغربی حصے (ہرات سمیت) پر ایرانی صفویوں اور مشرقی حصہ پر مغل اور پشتون قابض رہے۔ 1709ء میں پشتونوں نے میر ویس خان ہوتک کی قیادت میں صفویوں کے خلاف جنگ لڑی اور 1719ء سے 1729ء تک افغانستان بلکہ

ایرانی شہر اصفہان پر قبضہ رکھا۔ 1729ء میں ایرانی بادشاہ نادر شاہ نے انھیں واپس دھکیلا اوران کے قبضے سے تمام علاقے چھڑائے حتیٰ کہ 1738ء میں قندھاراور غزنی پر بھی قبضہ کر لیاجو 1747ء تک جاری رہا۔ پشتونوں اور فارسی بولنے والوں کی یہ کشمکش آج بھی جاری ہے حالانکہ دونوں مسلمان ہیں۔

احمد شاہ ابدالیؒ دُرانی کو بجا طور پر افغانستان کا بانی کہا جا سکتا ہے۔احمد شاہ درانی کو احمد شاہ ابدالی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔جون 1747ء میں نادر شاہ قتل ہو گیاجس کے بعد لویہ جرگہ نے احمد شاہ درانی کو سربراہ چن لیا۔پہلے قندھار میں اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد احمد شاہ درانی نے تمام تر قوت افغانستان کو ایک ملک بنانے پر صرف کی۔اس سلطنت میں موجودہ ایران،افغانستان،پاکستان اور بھارت کے کچھ علاقے شامل تھے۔اس کی سلطنت میں ایران کے شہر مشہد سے لیکر کشمیر اور موجودہ بھارت کے شہر دہلی تک کے علاقے شامل تھے۔ احمد شاہ درانی کا ایک اہم کارنامہ جنوری 1761ء میں پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کو شکست دینا تھا۔لیکن اس جنگ کے بعد سکھوں نے پنجاب میں اثر بڑھانا شروع کیااور آہستہ آہستہ پنجاب کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔لیکن اس وقت تک افغانستان کو ایک مضبوط ملک کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ 1772ء تک احمد شاہ درانی اور اس کے بعد اس کی اولاد کی حکومت رہی۔اس کی اولاد میں ایوب شاہ کو1823ء میں قتل کر دیا گیا۔بعد میں کابل کی حکومت محمد شاہ اور پھر 1826ء میں امیر دوست محمد خان نے کابل کی حکومت سنبھال لی۔اس نے روس اور ایران سے تعلقات بڑھانا شروع کیے کیونکہ سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا اور انگریزوں نے اپنی روایتی چالاکی کا ثبوت دیتے ہوئے سکھوں اور دہلی کے شاہ شجاع کے ساتھ مل کر افغانستان میں اپنا اثر بڑھانا شروع کیا۔ حالانکہ دونوں انگریزوں کے بظاہر دشمن تھے۔ شاہ شجاع کو انگریزوں نے کابل کے تخت کے سبز باغ دکھائے۔اس زمانے میں روس اور برطانوی ہند میں کئی ہزار میل کا فاصلہ تھااور وسطی ایشیاء کے شہروں مرو،خیوا،بخارااور تاشقند کو مغرب میں زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے مگر انگریز یہ جانتے تھے کہ روسی ان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ان کو روکنے اور افغانستان میں اپنااثر بڑھانے کے لیے انگریزوں کی مکارانہ جدوجہد کو عظیم چالبازیوں (The Great Game) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے [5]۔ اس سلسلے میں انگریزوں نے دو جنگیں لڑیں۔پہلی جنگ (1839ء-1842ء)اس وقت ہوئی جب ایرانیوں نے ہرات کے لوگوں کے ساتھ مل کر انگریزوں اور روسیوں کو افغانستان سے بے دخل کرنے کے لیے افواج پورے ملک میں روانہ کیں۔انگریزوں نے کابل پر قبضہ کر کے دوست محمد خان کو گرفتار کر لیا۔افغانیوں نے برطانوی فوج کے ایک حصے کو مکمل طور پر قتل کر دیاجو سولہ ہزار افراد پر مشتمل تھی،صرف ایک شخص زندہ بچا۔انگریز مدتوں اپنے زخم چاٹتے رہے اسی وجہ سے مجبوراًانگریزوں نے دوست محمد خان کو رہا کر دیا۔بعد میں دوست محمد خان نے ہرات کو بھی فتح کر لیا۔دوسری جنگ (1878ء-1880ء)اس وقت ہوئی جب امیر شیر علی نے برطانوی سفارت کاروں کو کابل میں رہنے کی اجازت نہ دی۔اس جنگ کے بعد انگریزوں کے ایما پر 1880ء میں امیر عبدالرحمٰن نے افغانستان کا اقتدار حاصل کیا مگر عملاً کابل کے خارجی معاملات انگریزوں کے ہاتھ میں چلے گئے۔اسی اثر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے افغانستان کے ساتھ سرحدوں کے تعین کا معاہدہ بھی کیا۔ امیر عبدالرحمٰن کے بیٹے امیر حبیب اللہ خان بعد میں افغانستان کے بادشاہ ہوئے۔ان کے دور میں افغانستان میں مغربی مدرسے کھلے اور انگریزوں کا اثر مزید بڑھ گیا،اگرچہ بظاہر انگریزوں نے افغانستان کو ایک آزاد ملک کے طور پر تسلیم کیا۔ 1907ء میں امیر حبیب اللہ خان نے انگریزوں کی دعوت پر برطانوی ہند کا دورہ بھی کیا۔اسی مغربی دوستی اور اثر کی وجہ سے امیر حبیب اللہ خان کو اس کے رشتہ داروں نے 20 فروری 1919ء کو

قتل کر دیا۔ اس کے قتل کے بعد اس کا بیٹا امان اللہ خان بادشاہ بن گیا اور انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی مگر 19 اگست 1919ء کو اس کے اور انگریزوں کے درمیان میں راولپنڈی میں ایک معاہدہ ہوا جس میں انگریزوں نے افغانستان پر اپنا کنٹرول ختم کیا اور افغانستان میں ان کا اثر تقریباً ختم ہو گیا۔ 19 اگست 1919ء کو اسی وجہ سے افغانستان کی یومِ آزادی کے طور پر منایا جاتا ہے۔

امان اللہ خان (دورِ اقتدار: 1919ء-1929ء) نے افغانستان کا اقتدار سنبھالنے کے بعد اصلاحات کیں اور مغربی دنیا سے تعلقات قائم کیے۔ اصلاحات میں بنیادی تعلیم کا لازمی قرار دینا اور مغربی طرز کی دیگر اصلاحات شامل تھیں۔ اس نے 1921ء میں افغانستان میں ہوائی فوج بھی بنائی جس کے جہاز روس سے آئے لیکن افواج کی تربیت ترکی اور فرانس سے کروائی گئی۔ 1927ء میں امان اللہ خان نے یورپ اور ترکی کا دورہ بھی کیا جس میں اس نے مغربی مادی ترقی کا جائزہ لیا اور افغانستان میں ویسی ترقی کی خواہش کی مگر جب اس نے کمال اتاترک کی طرز پر پردہ پر پابندی لگانے کی کوشش کی تو قبائل میں بغاوت پھوٹ پڑی اور افغان اس کے سخت خلاف ہو گئے۔ شنواری قبائل نے نومبر 1928ء میں جلال آباد سے بغاوت شروع کی اور دوسرے لوگوں کو ساتھ ملا کر کابل کی طرف بڑھنے لگے۔ شمال سے تاجک کابل کی طرف بڑھنے لگے۔ امان اللہ خان پہلے قندھار بھاگا اور فوج تیار کرنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوا جس کے بعد وہ بھارت فرار ہو گیا۔ وہاں سے پہلے اطالیہ اور بعد میں سوئٹزرلینڈ میں پناہ لی جہاں 1960ء میں وفات پائی۔ اس بغاوت کے دوران میں جنوری 1929ء میں حبیب اللہ کلاکانی عرف بچہ سقا نے کابل پر قبضہ کیا اور حبیب اللہ شاہ غازی کے نام سے حکومت قائم کی مگر اکتوبر 1929ء میں جنرل نادر خان کی فوج نے کابل کو گھیر لیا جس پر بچہ سقا فرار ہو کر اپنے گاؤں چلا گیا۔ جنرل نادر خان کو انگریزوں کی مکمل حمایت حاصل تھی جنہوں نے اسے ہتھیار اور پیسہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے جنرل نادر خان کو ایک ہزار افراد کی فوج بھی تیار کر کے دی تھی جو وزیرستانی قبائیلوں پر مشتمل تھی۔ نادر خان نے قرآن کو ضامن بنا کر اس کو پناہ اور معافی دی مگر جب وہ کابل آیا تو اسے قتل کروا دیا۔[6]

نادر خان (دورِ اقتدار 1929ء۔ 1933ء) جو امان اللہ خان کا رشتہ دار تھا اس نے نادر شاہ کے نام سے 1929ء میں افغانستان کا تخت سنبھالا۔ مگر 1933ء میں کابل کے ایک طالب علم نے اسے قتل کر دیا جس کے بعد اس کے انیس سالہ بیٹے ظاہر شاہ بادشاہ بن گیا۔ **ظاہر شاہ** (دورِ اقتدار 1933ء۔ 1973ء) نے چالیس سال تک افغانستان پر حکومت کی۔ وہ افغانستان کا آخری بادشاہ تھا، اس نے کئی وزیر اعظم بدلے جن کی مدد سے اس نے حکومت کی، جن میں سے ایک سردار محمد داؤد خان (المعروف سردار داؤد) تھا۔ سردار داؤد نے روس اور بھارت سے تعلقات بڑھائے، اسے پاکستان سے نفرت تھی۔ پاکستان سے تعلقات کی خرابی کی وجہ سے افغانستان کو اقتصادی مشکلات ہوئیں تو سردار داؤد کو 1963ء میں بحیثیت وزیر اعظم استعفی دینا پڑا۔ مگر **سردار داؤد** (دورِ صدارت 1973ء-1978ء) نے دس سال بعد 17 جولائی 1973ء کو ایک فوجی بغاوت میں افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ اس بغاوت کو روس (اس وقت سوویت یونین) کی مدد حاصل تھی۔ ظاہر شاہ فرار ہو کر اطالیہ چلا گیا۔ 27 اپریل 1978ء کو سردار داؤد کو ایک اور بغاوت میں قتل کر دیا گیا اور **نور محمد ترہ کئی** (30 اپریل 1978-14 ستمبر 1979ء) صدر بن گیا۔ اس بغاوت کو بھی روس کی مدد سے ممکن بنایا گیا۔ اس حکومت نے کمیونزم کو رائج کرنے کی کوشش کی اور روس کی ہر میدان میں مدد لی جن میں سڑکوں کی تعمیر سے لے کر فوجی مدد تک سب کچھ شامل تھا۔ روس کی یہ کامیابی امریکہ کو کبھی پسند نہیں آئی چنانچہ سی آئی اے (CIA) نے اسلامی قوتوں کو مضبوط کرنا شروع کیا جس سے ملک میں فسادات پھوٹ پڑے۔ نتیجتاً 1979ء میں روس نے افغانستان کی حکومت کی دعوت پر

افغانستان میں اپنی فوج اتار دی اور عملاً افغانستان پر اسی طرح روس کا قبضہ ہو گیا جس طرح آج کل امریکہ کا قبضہ تھا۔کابل میں صدارتی محل اپریل 1978ء مارکسی انقلاب کے بعد روس کی کمیونسٹ پارٹی نے کمال اتاترک کی طرز پر غیر اسلامی نظریات کی ترویج کی مثلاً پردہ پر پابندی لگانے کی کوشش کی۔ یہ تبدیلیاں افغانی معاشرہ سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔نور محمد ترکئی کے بعد **حفیظ اللہ امین**(14 ستمبر 1979ء-27 دسمبر 1979ء) صدر بن گئے۔ افغانستان میں حالات جب بہت خراب ہو گئے تو افغانی کمیونسٹ حکومت کی دعوت پر روس نے اپنی فوج افغانستان میں اتار دی۔ 25 دسمبر 1979ء کو روسی فوج کابل میں داخل ہو گئی۔اسی دوران **ببرک کارمل** (27 دسمبر 1979ء- 24 نومبر 1986ء)صدر بن گئے۔ افغانستان میں مجاہدین نے روسی فوج کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ امریکہ نے ان مجاہدین کو خوب مدد فراہم کی مگر امریکا کا مقصد اسلام کی خدمت نہیں بلکہ روس کے خلاف ایک قوت کو مضبوط کرنا تھا۔امریکہ کو پاکستان کو بھی ساتھ ملانا پڑا۔پاکستان کی مذہبی جماعتوں کو بھی امریکا نے روس کے خلاف استعمال کیا۔ افغان مجاہدین اسلام سے مخلص تھے مگر امریکا انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا رہا جب امریکا کو ان کی ضرورت نہ رہی تو وہی مجاہدین امریکی اور پاکستانی زبان میں دہشت گرد کہلانے لگے۔امریکی سی آئی اے پاکستان امریکہ اور سعودی عرب نے اس دوران میں اپنا اپنا کردار ادا کیا جس میں ان ممالک کے کچھ مفادات مشترک تھے اور کچھ ذاتی۔ ببرک کارمل کے بعد مختصر مدت کے لئے **حاجی محمد چمکنی** (24 نومبر 1986ء-30 ستمبر 1987ء)صدر بنے اس کے بعد **ڈاکٹر نجیب اللہ**(30 ستمبر 1987ء-16 اپریل 1992ء)افغانستان کے صدر بنے۔اس تمام دوران روس کے خلاف مجاہدین کا جہاد جاری رہا، اس جہاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ روس کو 1989ء میں مکمل طور پر افغانستان سے نکلنا پڑا بلکہ بعض دانشوروں کے خیال میں روس کے ٹوٹنے کی ایک بڑی وجہ یہی تھی۔ اس سلسلے میں روس، افغانستان اور پاکستان کے درمیان 1988ء میں جنیوا معاہدہ ہوا تھا۔روس نے افغانستان سے فوج نکالنے کے بعد بھی اس وقت کی نجیب اللہ حکومت کی مدد جاری رکھی مگر 18 اپریل، 1992ء کو مجاہدین کے ایک گروہ نے جنرل عبد الرشید دوستم اور احمد شاہ مسعود کی قیادت میں کابل پر قبضہ کر لیا اور افغانستان کو اسلامی دولت بنانے کا اعلان کر دیا۔ مگر امریکا اسلحہ کی مدد سے مجاہدین کے مختلف گروہوں کے درمیان میں اقتدار کے حصول کے لیے خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس وقت ایک اسلامی جہادی کونسل بنائی گئی جس کی قیادت پہلے **صبغت اللہ مجددی** (28 اپریل 1992ء-28 جون 1992ء)اور بعد میں **برہان الدین ربانی** (28 جون 1992ء-27 ستمبر 1996ء) نے کی مگر مجاہدین کی آپس کی لڑائی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بیرونی طاقتوں نے پشتو اور فارسی بولنے والوں کی باہمی منافرت کا خوب فائدہ اٹھایا۔اس وقت کی حکومت میں پشتونوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی جس سے ان میں شدید احساسِ محرومی پیدا ہوا۔پاکستان اور افغانستان کے کچھ علمانے مدرسوں کے طلبہ کو منظم کرنا شروع کیا جن کو بعد میں طالبان کہا جانے لگا۔ پاکستانی فوج کے جنرل نصیر اللہ بابر طلبہ کو استعمال کرنے کے خیال کے بانی تصور کئے جاتے تھے۔ 1996ء میں طالبان کے رہنما **ملا محمد عمر مجاہد**ؒ(27 ستمبر 1996ء-13 نومبر 2001ء) نے کابل پر قبضہ کیا۔ انہوں نے افغانستان کو امارت اسلامی قرار دیا اور طالبان نے انہیں امیر المؤمنین تسلیم کر لیا۔ طالبان نے 2000ء تک افغانستان کے 95 فی صد علاقے پر قبضہ کر کے ایک اسلامی حکومت قائم کی۔ اس زمانے میں افغانستان میں نسبتاً امن قائم رہا اور پوست کی کاشت بھی نہ ہوئی۔ طالبان کو بجز پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے کسی نے تسلیم نہ کیا اور مغربی دنیا نے شمالی اتحاد کی مدد جاری رکھی جو افغانستان کے شمال میں کچھ اختیار رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک خالص اسلامی حکومت مغربی دنیا اور بھارت کو ہر گز قبول نہ تھی۔ یاد رہے کہ طالبان سے پہلے بھارت کو

افغانستان میں خاصا عمل دخل تھا۔ طالبان کے دور میں پاکستان کا اثر افغانستان میں بڑھ گیا اور 50 سال میں پہلی دفعہ پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر ایک طرح سے دوستانہ امن قائم رہا۔ مگر پاکستان نے طالبان کے خلاف امریکہ کی مدد کر کے نہ صرف طالبان کا اعتماد کھویا بلکہ ایک پاکستان دشمن اور بھارت دوست حکومت افغانستان میں قائم ہو گئی۔

طالبان کے دور میں کچھ ایسے لوگوں نے افغانستان میں اپنے اڈے بنائے جو پہلے امریکا کے منظورِ نظر تھے مگر جب امریکا کو ان کی ضرورت نہ رہی تو وہ یکایک امریکا کی نظر میں دہشت گردوں میں تبدیل ہو گئے۔ ان میں اسامہ بن لادن اور اس کے حواری شامل تھے۔ جو افغانستان میں روس کے خلاف جہاد میں سرگرم تھے۔ 11 ستمبر 2001ء کے عالمی تجارتی مرکز (ورلڈ ٹریڈ سنٹر) کے حادثے کا الزام اسامہ بن لادن اور القاعدہ پر لگایا گیا۔ ان لوگوں کو طالبان نے پناہ دے رکھی تھی اور افغانی روایات کے مطابق انھیں دشمن کے حوالے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس بہانے 7 اکتوبر 2001ئ کو امریکا نے افغانستان پر پاکستان کی مدد سے حملہ کر دیا اور افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ امریکا نے بعد میں عراق پر بھی قبضہ کیا جس سے سوچا جاسکتا ہے کہ ایک تو اس نے عراق پر حملہ سے پہلے افغانستان میں ایسی حکومت کو ختم کیا جہاں سے ممکنہ مدد عراق کو جہاد کے نام پر مل سکتی تھی، دوسرے افغانستان اور عراق پر قبضہ کر کے اور پاکستان کو دباؤ میں رکھ کر امریکا نے ایران اور کسی حد تک اسلام کے مرکز سعودی عرب کو گھیرے میں لے لیا۔ خلیج فارس میں اتنی زیادہ امریکی بحری طاقت قائم ہو گئی جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ امریکی ایما پر جرمنی کے شہر بون میں ایک افغانی حکومت کا قیام عمل میں آیا جس کے سربراہ حامد کرزئی تھے۔ 9 اکتوبر 2004ء کو حامد کرزئی کو افغانستان کا صدر چن لیا گیا۔ **حامد کرزئی** (22 دسمبر 2001ء – 29 ستمبر 2014ء) اور بعد میں **ڈاکٹر اشرف غنی** (29 ستمبر 2014ء-15 اگست 2021ء) کی کٹھ پتلی حکومت میں افغانستان میں امریکی اور اتحادی فوج موجود رہے جو افغانستان کے اصل حاکم تھے۔ بھارت کا اثر و رسوخ افغانستان میں بہت زیادہ ہو چکا تھا، یہاں تک کہ بھارت اور امریکا پاکستان کے صوبے بلوچستان جیسے علاقوں میں پر تشدد کارروائیوں اور دہشت گردی کو خوب فروغ دے رہے تھے۔ 19 سال تک جنگ میں ناکامی کے بعد امریکہ نے طالبان سے 29 فروری 2020 کو دوحہ میں امن معاہدہ کر لیا جس کے مطابق تمام غیر ملکی افواج نے چودہ ماہ میں افغانستان سے انخلا کرنا تھا اور طالبان نے غیر ملکی افواج پر حملے بند کرنے تھے۔ دوحہ معاہدے کے چودہ ماہ بعد کافی حد تک غیر ملکی افواج انخلا کر چکی تھی۔ یکم مئی 2021 کو طالبان نے کٹھ پتلی افغان حکومت کے خلاف ایک مسلح کاروائی شروع کی اور بمشکل ساڑھے تین ماہ میں بیشتر افغان علاقوں کو فتح کر لیا اور 15 اگست 2021ء کو طالبان نے بغیر کسی مزاحمت کے کابل دوبارہ فتح کر کے **شیخ ہیبت اللہ اخندزادہ** (15 اگست 2021ء– تاحال) کے امارت میں امارت اسلامی افغانستان کو بحال کر دیا۔ 30 اگست کو بقیہ غیر ملکی افواج بھی انخلا کر گئیں۔ 17 اگست 2021ء کو بقیہ افغان فوج اور حکومتی عہدیداروں نے صوبہ پنجشیر میں امر اللہ صالح اور احمد مسعود کی قیادت میں ایک حکومت قائم کی اور طالبان کے خلاف مسلح کارروائیوں کا آغاز کیا اور 6 ستمبر 2021ء تک شکست کھا گئے اور طالبان پنجشیر میں داخل ہو گئے۔ 07 اکتوبر 2021ء کو ترجمان طالبان ذبیح اللہ مجاہد نے ایک پریس کانفرنس کرتے ہوئے 33 ارکان کو عبوری حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر تعینات کرنے کا اعلان کیا۔ **ملا محمد حسن اخوند** افغانستان کے عبوری وزیر اعظم مقرر کیے گئے۔ [7]

افغانستان چاروں طرف سے خشکی سے گھرا ہوا ملک ہے جس کا کوئی ساحلِ سمندر نہیں، اسی لئے اس کی سمندری تجارت پاکستان کے ذریعے ہوتی ہے۔ زیادہ علاقہ پہاڑی ہے جو زیادہ تر کوہ ہندوکش پر مشتمل ہے۔ افغانستان میں پانی کی شدید کمی ہے اگرچہ چار دریا ہیں جن کے نام

دریائے آمو، دریائے کابل، دریائے ہلمند اور ھریرود ہیں۔ اونچا ترین مقام نوشک ہے جو 24,557 فٹ بلند ہے اور ترچ میر کے بعد کوہ ہندوکش کا دوسرا اونچا پہاڑ ہے۔ سطح سمندر سے سب سے کم بلند علاقہ (پست ترین مقام) دریائے آمو ہے جو صرف 846 فٹ بلند ہے۔ افغانستان کی جغرافیائی سرحد 5529 کلومیٹر لمبی ہے جس میں سب سے زیادہ علاقہ (2,640 کلومیٹر) پاکستان کے ساتھ لگتا ہے۔ 12٪ علاقہ زراعت کے قابل ہے مگر صرف 0.22٪ علاقہ زیرِ کاشت ہے۔ چونکہ زیادہ علاقہ پہاڑی ہے اس لئے زلزلے کثرت سے آتے ہیں۔ افغانستان کے علاقے میں سونا، چاندی، کوئلہ، تانبا، کانسی، کرومائیٹ، جست، گندھک، لوہا، قیمتی پتھر اور نمک پائے جاتے ہیں اور تیل کے بھی وسیع ذخائر ہیں۔ یہ تمام قدرتی وسائل مسلسل جنگ کی وجہ سے کبھی استعمال نہیں ہو سکے۔ افغانستان کا موسم شدید ہے یعنی گرمیوں میں شدید گرمی اور سردیوں میں شدید سردی ہوتی ہے مگر سردیاں زیادہ شدید ہیں۔ کابل میں دو سے تین ماہ برف پڑی رہتی ہے۔ جلال آباد اور اس سے نیچے کا موسم نسبتاً گرم ہے۔ زیادہ بارشیں گرمیوں میں ہوتی ہیں جب برصغیر میں مون سون ہوتا ہے۔

افغانستان دنیا کے غریب ترین ممالک میں شامل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ روس اور امریکا کی کشمکش اور اس علاقے میں ان کے مزموم مقاصد ہیں۔ افغانستان مسلسل جنگ کا شکار رہا ہے اور اسے معاشی ترقی کی مہلت ہی نہیں ملی۔ افغانستان کی خاصی آبادی ایران اور پاکستان کو ہجرت کر گئی تھی جن میں سے کچھ اب واپس آنا شروع ہوئے ہیں مگر ہجرت نے ان کی معیشت کو تباہ کر دیا ہے اور نئی پود کو پڑھنے لکھنے اور کوئی ہنر سیکھنے کے مواقع بھی کم ہی ملے ہیں۔ افغانستان میں جن لوگوں نے ہجرت نہیں بھی کی انھیں جنگ نے مصروف رکھا۔ مجبوراً اسلحہ کی تجارت، جنگ بطور سلسلہ روزگار اور افیوم و پوست کی تجارت ہی ان کا مقدر بنی۔ ایک بڑی تعداد سمگلنگ سے بھی وابستہ ہوئی۔ بہت معمولی تعداد پوست کے علاوہ دوسری اجناس بھی کاشت کرتی ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بنک کے مطابق 2001ء کے بعد معیشت نے خاصی ترقی کی ہے مگر اس سلسلے میں کوئی قابلِ اعتماد اعداد و شمار نہیں ملتے۔ البتہ افغانستان سے باہر رہنے والے افغانیوں نے اب کچھ سرمایہ کاری شروع کی ہے مثلاً 2005ء میں دبئی کے ایک افغانی خاندان نے ڈھائی کروڑ ڈالر سے کوکا کولا کا ایک پلانٹ افغانستان میں لگایا ہے۔ افغانستان کو ابھی غیر ملکی امداد پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور 2006ء میں زرِ مبادلہ کے بیرونی ذخائر صرف پچاس کروڑ امریکی ڈالر کے لگ بھگ تھے۔ افراطِ زر افغانستان کا ایک بنیادی مسئلہ رہا ہے اور افغانی روپیہ کی قیمت بھی مسلسل گرتی رہی ہے مگر اب حالات کچھ بہتر ہیں۔ 2003ء کے بعد 14 نئے بنک بھی کھلے ہیں جن میں کئی غیر ملکی بنک بھی شامل ہیں۔ افغانستان کئی بین الاقوامی اداروں کا رکن ہے اور حال میں توسارک (SAARC) کا رکن بھی بنا ہے۔ ایک اہم پیش رفت قدرتی گیس کی دریافت ہے جس کا استعمال اور فروخت بڑے پیمانے پر شروع ہونے کی امید ہے۔

افغانی ثقافت کی تین اہم بنیادیں ہیں۔ ایرانی ثقافت، پشتون ثقافت اور اسلام۔ اس میں اسلام کا اثر سب سے زیادہ ہے۔ افغانیوں کیلئے ان کا ملک، قبیلہ سے وفاداری، مذہب، اپنا شجرہ نسب اور سب سے بڑھ کر آزادی بہت اہم ہیں۔ مذہب کے ساتھ ساتھ شاعری اور موسیقی بھی ان کی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔ افغانستان کے کھانے بھی لاجواب ہوتے ہیں جن میں سے افغانی یا کابلی پلاؤ، خمیری روٹی اور تکے کباب شاید دنیا میں اپنی قسم کے مزیدار ترین کھانوں میں شامل ہیں جو دیگر علاقوں میں بھی مقبول ہیں۔ بزکشی ان کا قومی کھیل ہے جو پولو سے ملتا جلتا ہے۔

افغانستان ایک تاریخ رکھتا ہے جس کے نشان جا بجا آثارِ قدیمہ کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اگرچہ تعلیم کی شرح کم ہے مگر قرآن و مذہب کی تعلیم اور شاعری خصوصاً قدیم فارسی شاعری ان کی زندگی اور خیالات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ افغانستان کی سرزمین کو

قدیم زمانے میں خراسان بھی کہا جاتا تھا۔ اب خراسان ایران کے ایک حصے کو کہا جاتا ہے مگر یہ دونوں علاقے (ایرانی اور افغانی خراسان) تاریخی طور پر ہمیشہ متعلق رہے ہیں۔ افغانی خراسان نے بڑے اہم لوگوں کو جنم دیا ہے جن کو عام لوگ عرب سمجھتے ہیں، مثلاً امام ابو حنیفہ، بو علی سینا، مولانا رومی، ابو الحسن الفارابی، مشہور صوفی شاعر نورالدین عبد الرحمٰن جامی، خواجہ عبد اللہ انصاری، امام فخر الدین رازی، شیخ المشائخ حضرت علی بن عثمان داتا گنج بخش ہجویری اور سید محمدؒ عثمان مروندی لعل شہباز قلندر جیسے سینکڑوں اہل اللہ اور نامور شخصیات جیسے کاکڑ قوم کا جد امجد "کاک نیکہ" کا تعلق افغانستان سے ہے۔ کاک نیکہ پشتون قوم کے ایک بہت بڑے، ممتاز قبیلہ "کاکڑ" کے مورث اعلیٰ ہیں۔ کاک نیکہ یا کاکڑ نیکہ پشتون قوم کے جد امجد قیس عبد الرشید کے پڑپوتے، غور غشت نیکہ کے پوتے اور دانی نیکہ کے بیٹے تھے، دنیا میں پھیلے ہوئے کاکڑ قوم آپ کی اولاد ہیں۔ کاک نیکہ کوہستان یعنی غور میں پیدا ہوئے اور ہرات میں سپرد خاک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل آپ کو آبائی علاقے کوہستان یعنی غور میں سپرد خاک کیا گیا لیکن بعد میں آپ کو افغانستان کے سرحدی شہر ہرات کے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس دفن کیا گیا، آج بھی آپ کا مزار ہرات افغانستان میں موجود ہے۔

04 جنوری 2023ء کو استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر عبد العلی اچکزئی صاحب کے گھر میں اپنے سفر کے ترتیب کو حتمی شکل دیتے ہوئے اگلے دن یعنی 05 جنوری کو اپنے پاسپورٹ افغانستان قونصلیٹ کوئٹہ میں سیاحتی ویزہ کے لئے جمع کر دیئے۔ چونکہ پروفیسر ڈاکٹر عبد العلی اچکزئی ،بلوچستان یونیورسٹی سے 04 اپریل 2022ء کو ریٹائرمنٹ لے چکے تھے اس لئے ان کو NOC کی ضرورت نہیں تھی، چنانچہ میں نے سالانہ تعطیلات کی بناء پر صرف NOC کے لئے محکمہ تعلیم کالجز بلوچستان میں درخواست دی۔ تعجب اس وقت ہوا جب ڈیپارٹمنٹ میں مجھے یہ کہا گیا کہ آپ کی درخواست ہم محکمہ داخلہ بھجوائیں گے کیونکہ انڈیا و افغانستان جانے کے لئے محکمہ داخلہ کی اجازت کے بغیر ہم NOC جاری نہیں کر سکتے۔ لہذا محکمہ تعلیم کالجز کی جانب سے محکمہ داخلہ کو میرے اجازت نامہ کے لئے لکھا گیا۔ محکمہ داخلہ جا کر ایک اور آفت سے سامنا ہوا، وہ یہ کہ انہوں نے میر ادرخواست سپیشل برانچ کو بھیجا کہ (میرے حوالے سے) تحقیق کیا جائے اور کلیرنس کر کے محکمہ داخلہ کو آگاہ کیا جائے، بہر حال اس میں تین چار دن لگے اور بالاخر سپیشل برانچ اور محکمہ داخلہ کے اجازت نامہ کے بعد 09 جنوری 2023ء کو محکمہ تعلیم کالجز بلوچستان سے مجھے NOC مل ہی گیا اور اسی دن افغانستان قونصلیٹ کوئٹہ سے ویزہ بھی مل گیا۔ یوں ابتدائی مرحلہ طے کر کے اگلے دن سفر روانگی کی تیاری شروع کی۔ افغانستان جانے سے قبل قندھار میں موجود میرے والد صاحب کے ایک مرید و مخلص حاجی عبد اللہ صاحب سے رابطہ کیا اور اپنے آنے کے متعلق ان کو آگاہ کیا، چنانچہ انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہتے ہوئے بولدک بارڈر پر گاڑی بمعہ ڈرائیور کے اہتمام کا ذمہ لیا۔

11 جنوری 2023ء کو ہم صبح 10 بجے کے قریب ٹیکسی سٹینڈ کوئٹہ سے چمن کے لئے روانہ ہوئے۔ کوئٹہ اور پھر چمن تک رستے میں بوندا باندی میں سفر جاری رہا، کوژک ٹاپ پہنچ کر برف سے سفید پوش اور دھند سے لپٹی پہاڑی سلسلے نے استقبال کیا، جس میں گاڑی انتہائی آہستہ اور احتیاط سے جارہی تھی، کوژک میں 25 منٹ کا یہ سفر ہم نے تقریباً ایک گھنٹے میں طے کیا اور 2 بجے ہم چمن پہنچے۔ (حاجی عبد اللہ صاحب اسی دن اپنی فیملی کے ہمراہ علاج معالجہ کے بعد کراچی سے چمن آئے تھے، اور فیملی کو چمن بولدک بارڈر پر قندھار سے آئے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی حاجی عبید اللہ کے حوالے کی تھی جو ان کے فیملی کو لیکر واپس قندھار چلے گئے تھے جبکہ خود حاجی عبد اللہ چمن میں ہمارے انتظار میں تھے۔ تاکہ ہمیں ذرائع سفر اور کندہار رابطہ کے متعلق آگاہ کر کے خود ذاتی کام کے سلسلے میں واپس کراچی بعد ازاں لاہور جارہے تھے)۔ چمن میں

ظہر نماز ادا کرنے اور حاجی عبد اللہ صاحب کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد حاجی صاحب نے ہمیں اپنی گاڑی میں بارڈر تک پہنچایا۔ یہاں انہوں نے اپنے بھانجے اور داماد عزیز اللہ جان کو کندھار فون کرتے ہوئے ہمارے آنے کی اطلاع دی اور بارڈر میں (حاجی عیسی منڈی میں پارک) اپنی گاڑی کی چابی ہمارے حوالے کرتے ہوئے ہمیں الوداع کیا۔ بارڈر پر ابتدائی سامان تلاشی کے بعد ہم آگے بڑھے، بارش کی وجہ سے راستہ کیچڑ سے بھرا "کوئٹہ سٹی نالے" کا منظر پیش کر رہا تھا۔ راستے میں بڑے، بچے، بوڑھے اور خواتین بڑی اذیت سے دوچار تھے، پھسلن میں کئی لوگوں کو گرتے دیکھا جبکہ میں خود بھی بری طرح پھسل گیا اور ہاتھ پر چھوٹ بھی لگی بہر حال یہ ایک کلومیٹر کا رستہ بڑی اذیت سے طے کیا۔ Exit Point ملک سے خروج کے مقام پر پہنچ کر پروفیسر ڈاکٹر عبد العلی اچکزئی کو ایک سرکاری اہلکار (ظہیر ترین صاحب) نے پہچانا اور اپنا تعارف کرایا، ان کی بیگم پروفیسر ڈاکٹر عبد العلی اچکزئی کی شاگردہ اور سردار بہادر خان ویمن یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ ظہیر صاحب کی رہنمائی میں ہماری ضروری سفری کاروائی مکمل ہو کر ہم بارڈر پار ویش چلے گئے (ویش افغانستان میں بارڈر کو کہا جاتا ہے اسی لئے بارڈر کی وجہ سے اس علاقے کو ویش کہا جاتا ہے)۔ یہاں افغانستان بارڈر (ویش) آرمی کے اہلکاروں نے پاسپورٹ چیک کرتے ہوئے ہمیں متعلقہ شعبے (جسے وہ پاسپورٹ کا شعبہ کہتے تھے) کی طرف جانے کا اشارہ کیا، پاسپورٹ آفس میں ہمارے پاسپورٹ پر Entry (دخول / راتگ) کا سٹیمپ لگایا اور مجھے ایک پروفارما دیا کہ آپ قندھار میں اسے استخبارات (جسے ہم سپیشل برانچ کہتے ہیں) سے دستخط کروا کر واپسی میں جمع کروائیں گے۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب کو اس پروفارما سے مبرا کیا کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی عمر 60 سال سے اوپر تھی اور افغانستان کے قانون کے مطابق عمر رسیدہ افراد کے لئے قوانین میں بڑی نرمی برتی جاتی ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم ویش میں داخل ہو چکے تھے اور حاجی عیسی منڈی کا پوچھ کر وہاں گئے جہاں ہمارے لئے گاڑی کھڑی تھی۔ پارکنگ سے گاڑی نکال کر ہم نے قندھار کے لئے راہ لی، اور ابتداء میں ہی مجھ سے غلط سائیڈ پر ڈرائیونگ کرنے کی غلطی ہوئی کیونکہ افغانستان میں ڈرائیونگ سیدھے طرف ہوتا ہے، بہر حال یہی میری پہلی و آخری غلطی تھی۔ قندھار جاتے ہوئے جابجا برساتی نالوں سے سامنا ہوتا رہا، ایک مقام پر تصاویر بھی لئے اور آگے جا کر "تختہ پل" کے مقام پر عصر نماز ادا کی۔ یہاں پر موسم صاف لیکن برداشت نہ ہونے والی سردی تھی۔ نماز کے بعد سفر جاری رکھتے ہوئے مغرب نماز ہم نے قندھار ایئرپورٹ کے علاقے میں ادا کی اور عشاء سے قبل قندھار پہنچے۔ قندھار میں حاجی عبد اللہ صاحب کے بھانجے اور داماد عزیز اللہ جان ہمارے ساتھ رابطے میں تھے اور بار بار وٹس اپ پر کال کرتے ہوئے قندھار کے مشہور ہاؤسنگ سوسائٹی "عینو مینہ" میں اپنے گھر کی طرف جانے والے رستے کی رہنمائی کرتے، بالاخر ہم خیریت سے حاجی عبد اللہ صاحب کے گھر پہنچ گئے۔

ویش بارڈر اور بولدک سے قندھار جاتے ہوئے راستے میں تباہ و ویران آبادیوں سے گزر ہوتا رہا، ہر جگہ کھنڈرات ہی دکھائی دیے، جابجا جنگ زدہ ویران علاقے ببانگ دھل آواز دے رہے تھے کہ میں (افغانستان) جنگ سے بہت تھکا ہوا ہوں، میرا جسم زخموں سے چور چور ہے، میرے بچے یتیم بے بس اور لاچار ہیں، میرے خاندان کے افراد دیار غیر میں کسم پرسی، لاچاری، غربت اور ذلالت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، میں غیر تو غیر اپنوں کی لاپرواہی سے بھی بہت نالاں ہوں۔ خدارا میری حالت پر رحم کر، دیار غیر کے سرکش، ظالم و جابر میری حویلی کو اپنی ہوس کا نشانہ نہ بنائیں، میری اپنی کچھ ناخلف اولاد غیروں کے آلہ کار بن کر میری دامن کو تار تار نہ کریں، میری جسم مزید زخموں کی متحمل نہیں، میں تھک چکا ہوں، خدارا اب بس کریں۔ مجھے جینے دیں، میری بچوں کو جینے کا حق دیں، پڑھنے کا حق دیں، میرے بچے اور بچیاں تعلیم ہنر اور دنیاداری کے میدان میں کسی سے کم نہیں لہذا ان پر تعلیم و ہنر اور جینے و دنیاداری کے دروازے بند نہ کریں۔ یہی آوازیں تھیں جو ہمارے

کانوں کے پردوں سے ٹھکرا رہی تھیں اور ہم ان آہ و گریاں کی گونجوں میں اپنا سفر محو حیرت ہو کر طے کر رہے تھے۔ راستے میں چند چیک پوسٹوں پر سے گزر ہوا، ہر چیک پوسٹ پر سرکاری اہلکار علیک سلیک کے بعد بڑے مؤدبانہ انداز سے مخاطب ہوتے، آنے جانے کے مقام اور وجہ پوچھ کر ان الفاظ کے ساتھ الوداع کرتے کہ (بخشہ کوئ، ستاسو وخت موضائع کئ) معزرت چاہتے ہیں ہم نے آپ کو روک کر آپ کا وقت ضائع کیا۔

12 جنوری 2023ء کو صبح ناشتے کے بعد والد صاحب کے ایک مرید و مخلص محمد سلیمان کو فون کیا اور اپنے آنے کی خبر دی، انہوں نے رہائش کا پوچھ کر 20 منٹ میں ہمارے پاس پہنچنے کا بتایا، لیکن ہم نے اسے اس بناء پر آنے سے منع کیا کیونکہ ہم شہر کے ایک حصے میں تھے اور وہ دوسرے حصے میں ، چونکہ ہمارے پاس گاڑی تھی لہذا ان کا ایڈریس پوچھ کر ہم خود وہاں ان کے ٹھکانہ پہنچے (ان کا کندھار میں مد د چوک پر "میلکو" کے نام سے بہت بڑی بیکری تھی) تازہ دودھ ، کویا اور رنگارنگ ماکولات و مشروبات سے ہماری خاطر تواضع کرنے کے بعد ان کے معیت میں قندھار شہر کو دیکھنے نکلے۔ شہر کے مختلف حصے خصوصا پرانے قندھار شہر کے بازار، شہیدان چوک، جامع عمر (جو پہلے اس مقام پر سینما تھی بعد میں طالبان رہنما ملا محمد عمر مجاھدؒ نے یہاں جامع مسجد کی بنیاد رکھی، اسی نسبت سے اسے جامع عمر کہا جاتا ہے)، سرپوش بازار، شکارپور دروازہ، دوراہی وغیرہ دیکھنے کے بعد قندھار کے قدیمی قبرستان "حضرت جی بابا" گئے۔ وہاں پہنچ کر حیرت زدہ ہوئے کیونکہ لوگوں نے قبرستان کے اندر بلکہ قبروں کے اوپر آبادیاں کی تھیں۔ یہاں میں 1998ء میں زمانہ طالبعلمی میں گورنمنٹ سائنس کالج کوئٹہ کے دوستوں کے ساتھ آیا تھا، اس وقت تاحد نگاہ قبرستان ہی تھا لیکن اب اس کا نقشہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔ اس قبرستان میں میرے اجداد میں سے دو جد امجد، سید میاں خالق دادؒ اور سید میاں عبدالرحیمؒ کے قبور بھی تھے جن کا اس وقت میں نے زیارت کیا تھا لیکن اس بار بعد از تلاش بسیار بھی وہ مقامات مجھے نہ مل سکے۔ تاہم اسی قبرستان میں ایک گوشے کو مختص کئے ہوئے میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے چھوٹے بھائی سید خیر الدین جان آغاؒ (جو خود ہرات میں مدفون ہیں) کے خاندان کے قبروں پر حاضری دی اور دعا کی۔ یہاں پر سید خیر الدین جان آغاؒ کے تین صاحبزادے سید حمد اللہ جان آغاؒ، سید محب اللہ آغاؒ عرف ملنگ آغا اور سید حبیب اللہ آغاؒ مدفون ہیں جبکہ سید سعد اللہ آغا حیات ہیں۔ اس کے بعد قندھار کے مشہور روحانی شخصیت "حضرت جی باباؒ" کے مرقد پر حاضر ہو کر دعا کی۔ یہاں سے ہم والد صاحب کے ایک مخلص و خلیفہ حاجی عبد القیوم "مامک" کے رہائش گاہ پر پہنچے جنہوں نے پرتپاک استقبال کیا اور کافی دیر تک گپ شپ کے بعد ان سے رخصت لیکر ظہر نماز کے لئے میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے چھوٹے بھائی سید مولانا محمد عمر جان آغاؒ کے مسجد اور خانقاہ گئے جو شہر کے درمیان "دیخوجہ" میں واقع ہے۔ یہ مسجد پہلی بار 1280 قمری سال یعنی 121 سال پہلے بنا تھا اور موجودہ تعمیر دوسری مرتبہ کی ہے جو 16 سال پہلے جدید تعمیر کی گئی ہے۔ آپؒ بڑے عالم اور ولی اللہ تھے۔ آپؒ کے مریدین کا حلقہ افغانستان کے علاوہ موجودہ پاکستان وہندوستان تک پھیلا ہوا تھا، پاکستان میں لورالائی، دکی، سنجاوی، ہرنائی اور کوہلو کے علاقوں میں آپؒ کے ہزاروں مرید موجود تھے۔ آپؒ کی وفات سفر حج کے دوران سعودی عرب کے شہر جدہ میں ہوئی ہے اور وہیں پر مدفون ہیں۔ آپؒ کے بعد آپؒ کے فرزند سید عبداللہ جان آغاؒ عرف باچا آغا نے بھی ہندوستان کے علاوہ مذکورہ علاقوں خصوصا ضلع دکی نانا صاحب اور ضلع ہرنائی کے علاقہ سپین تنگی کو اپنا مسکن بنایا۔ سپین تنگی ضلع ہرنائی میں اب بھی آپؒ کے پوتے (سید رحیم جان آغا، سید کریم جان آغا اور سید امین جان آغا) رہائش پزیر ہیں۔ سید عبداللہ جان آغا عرف باچا آغا کی دوسری اہلیہ کا تعلق مری قبیلہ سے ہے، جن کی اولاد (سید نوانی آغا، سید طارق آغا وغیرہ) اس وقت ضلع سبی میں آباد ہیں۔ سید عبداللہ جان آغاؒ عرف باچا آغا کی وفات 1992ء

میں ہوئی اور ضلع دکی ناناصاحب میں حضرت میاں عبدالحکیم ناناصاحبؒ کے مزار سے ذرا فاصلے پر برلب سڑک مدفون ہیں۔ (یہاں اس نکتہ کی طرف اشارہ کروں گا کہ میری فیملی میں ایک عرصے کے بعد 1979ء میں میری پیدائش ہوئی، تو سید عبداللہ جان آغاؒ عرف باچا آغا جو میرے دادا سید خواجہ احمد آغاؒ کے چچازاد بھائی تھے، میری پیدائش پر دادا جانؒ کو مبارکباد دینے آئے تھے، اس دوران میرے نام کا پوچھا تھا کہ بچے کا نام کیا رکھا ہے؟ دادا جانؒ نے فرمایا کہ نام رحمت اللہ رکھا ہے، تو سید عبداللہ جان آغاؒ نے کہا تھا کہ آج سے اس کا نام باچا آغا ہے یعنی اپنے نام کی نسبت سے میرا نام رکھا۔ چنانچہ اسی دن سے بندہ باچا آغا ہی لکھنے وپکارنے لگا۔ اللہ تعالیٰ ان اولیاء اللہ کے برکات ہم پر جاری وساری رکھیں۔

دیخوجہ سے ہم واپس محمد سلیمان کے ساتھ ان کے بیکری آئے، یہاں کھانا کھایا اور عصر کا آذان ہوتے ہی مدد چوک کے مسجد میں نماز عصر ادا کی۔ مغرب نماز کے لئے ہم جامع مسجد خرقہ شریف پہنچے۔ نماز کے بعد مسجد کے ساتھ مزار خرقہ مبارک کی زیارت کے لئے گئے۔ شب جمعہ کو خرقہ مبارک زیارت کے لئے کھول دیا جاتا ہے چونکہ آج شب جمعہ تھی لہذا ہم نے بھی موقع کو غنیمت جان کر زیارت کی شرف حاصل کی۔ **خرقہ مبارک**، حضور ﷺ کی خرقہ مبارک ہے جسے احمد شاہ ابدالیؒ نے 1147 شمسی سال بمطابق سال 1182 قمری میں قندھار لایا اور آج تک یہاں محفوظ ہے، عام وخاص ان کی زیارت کرتے ہیں۔ ان کے بکس کھولنے کا کسی کو اجازت نہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ نے جب 1312 قمری میں قندھار کا دورہ کیا تو خرقہ مبارک کی زیارت کی اور اس دوران یہ اشعار فرمائے کہ:

قندھار آن کشور مینو سواد	اھل دل را خاک اوخاک مراد
کوی آن شھر است ماراکوی دوست	ساربان بربند محمل سوی دوست
خرقہ آن برزخ لا یبغیان	دیدمش در نکتہ (لی خرقتان)
آمد از پیراھن او بوی او	داد ما را نعرۂ اللہ ھو [8]

خرقہ مبارک کے زیارت کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالیؒ کے مزار پر حاضری دی اور دعا کی۔ **احمد شاہ ابدالی** کا مقبرہ قندھار شہر کے وسط میں خرقہ مبارک کے مزار سے متصل ہے۔ افغانی اکثر اسے "احمد شاہ بابا" کہتے ہیں۔ احمد شاہ درانی (1722ء-16 اکتوبر 1772ء) جسے احمد خان ابدالی بھی کہا جاتا ہے، درانی سلطنت کا بانی تھا اور جدید ریاستِ افغانستان کے بانی کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ احمد شاہ درانی ہرات موجودہ افغانستان یا ملتان اس وقت مغل سلطنت اور موجودہ پاکستان میں 1722 میں ابدالی قبیلے کے سردار اور ہرات کے گورنر محمد زمان خان اور خالو خان الکوزئی کی بیٹی زرغونہ بیگم کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ وہ نادر شاہ افشار کی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا اور بہت جلد ابدالی دستہ کا کمانڈر بن گیا، جو چار ہزار ابدالی پشتون سپاہیوں کا گھڑ سوار دستہ تھا۔ 1747ء میں نادر شاہ افشار کے قتل کے بعد، احمد شاہ درانی کو افغانستان کا شاہ منتخب کیا گیا۔ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد، اس نے ہندوستان کی مغل اور مرہٹہ سلطنت کو مشرق کی طرف، فارس کی منتشر سلطنتِ افشاری کو مغرب کی طرف اور بخارا کے خانات کو شمال کی طرف دھکیل دیا۔ کچھ سالوں میں اس نے مغرب میں خراسان سے لیکر مشرق میں کشمیر اور شمالی ہندوستان تک اور شمال میں دریا آمو سے لے کر جنوب میں بحیرہ عرب تک اپنا اقتدار بڑھالیا۔

احمد شاہ سخت مذہبی مزاج کا حامل شخص تھے، اسے اولیاء وعلماکرام کی صحبت بہت پسند تھی وہ درویشوں اور علما کی بڑی عزت کرتے تھے، اس نے بے شمار اولیاء کرام کے مزارات کی زیارت کی، ہر جمعرات کو علماوفقراء کو کھانے پر بلاتے، ان سے مذہب اور دیگر علوم پر گفتگو

کرتے۔ اس کے دربار میں سلطنت کے اعلیٰ عہدے دار اور امرا ادب سے کھڑے رہتے لیکن سیدوں اور علماء کو کرسی ملتی تھی۔ احمد شاہ درانی ان تمام عیوب سے مبرا تھے جو عموماً مشرقی اقوام کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں مثلاً شراب نوشی یا افیون کی بدمستی، لالچ، ظلم، تعلقات میں دوغلاپن وغیرہ۔ وہ مذہب کا بڑا حامی تھا، اپنی رحمدلی اور فیاضی کی بدولت رعایا کے ہر طبقے میں بے حد مقبول تھے۔ احمد شاہ ابدالیؒ کے باقاعدہ کسی مکتب سے تعلیم یافتہ ہونے کا دستاویزی ثبوت نہیں ملتا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ پڑھا لکھا تھا کیونکہ اسے تمام ملکی زبانوں پر عبور حاصل تھا، احمد شاہ ایک شاعر بھی تھا اس کی شاعری میں سادہ پن پایا جاتا ہے۔ اس کا لکھا ہوا سب سے مشہور پشتو نظم قوم کا محبت تھا، جس میں انہوں نے لکھا:

ستا د عشق لہ مینی ڈک سول زیگرونہ   ستا پہ لارہ کی بایلی زلمی سرونہ

تا تہ راشمہ زڑگی زمی فارغ شی   بے لہ تامی اندیشنی دی زڑہ مارونہ

کہ ہر سہ می د دنیا ملکونہ ڈیر شی   زما بہ ھیر نشی داستا شکلی باغونہ

د دھلی تخت ھیر ومہ چی رایاد کم   زما د شکلی پشتونخوا دغرو سرونہ

ترجمہ: خون کے ذریعہ، ہم آپ کی محبت میں غرق ہیں۔ نوجوان آپ کی خاطر اپنے سر کھو دیتے ہیں۔ میں آپ کے پاس آیا ہوں اور میرے دل کو سکون ملا ہے۔ تجھ سے دور، غم میرے دل سے سانپ کی طرح لپٹ گیا۔ میں دہلی کا تخت بھول جاتا ہوں جب مجھے اپنی خوبصورت پختون خوا کی پہاڑی چوٹی یاد آتی ہے۔ اگر مجھے دنیا اور آپ کے درمیان انتخاب کرنا ہوگا، میں تمہارے بنجر صحراؤں کو اپنا دعوی کرنے میں دریغ نہیں کروں گا۔

احمد شاہ ابدالیؒ کی ظاہری شخصیت شاندار، پر اثر، غیر معمولی پر وقار اور بارعب تھی، اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی، اس کے روشن اور پر اثر چہرے پر ایسی کشش تھی کہ تمام افغان اسے بے پناہ چاہتے اور اس کا عزت واحترام کرتے تھے، یہ اس کی غیر معمولی شخصیت کا ہی اثر تھا کہ جب آصف جاہ نظام الملک نے 1739ء میں جب دیوان عام کے باہر لال قلعہ دہلی میں احمد شاہ ابدالی کو پہلی بار دیکھا تو اسے احمد شاہ کے چہرے پر ایک حکمران کی سی چمک اور جلال نظر آیا، تو اس نے فوراً نادر شاہ سے پوچھا "یہ نوجوان جو باہر ڈیوٹی پر کھڑا ہے کون ہے؟ "نادر شاہ نے جواب دیتے ہوئے کہا "یہ احمد خان ہے" نظام الملک نے کہا "مجھے اس میں ایک حکمران کی شخصیت نظر آئی ہے"۔ احمد شاہ نے لڑکپن ہی میں اپنی غیر معمولی شخصیت اور ذہانت کی وجہ سے نادر شاہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی، نادر شاہ نے ہمیشہ اس کے لئے تعریفی کلمات استعمال کئے، ایک بار نادر شاہ نے اپنے درباریوں کو کہا کہ: "میں نے ایران، توران اور ہندوستان میں ایسا ذہین شخص نہیں دیکھا جتنا کہ احمد خان ہے" ۔نادر شاہ کو تو آخری عمر میں یہ پوری طرح احساس ہو گیا تھا کہ احمد خان ہی اس کے بعد حکمران بنے گا، حتیٰ کہ جب پیر صابر شاہ صاحبؒ نے احمد خان کو پہلی بار دیکھا تو فوراً کہہ اٹھے کہ تم ایک دن حاکم بنو گے۔ یہ احمد خان کی بلند کرداری تھی کہ اس کے باوجود اس کی نادر شاہ سے وفاداری میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور اس کا اپنے افغان سرداروں کے ساتھ سلوک بھی تبدیل نہ ہوا۔ جب نادر شاہ کے قتل کے بعد احمد سعید خان جو والی لاہور محمد زکریا خان اور والی کابل نصیر خان کا نمائندہ تھا 2 کروڑ روپے کا خزانہ جس میں زر نقد اور بے شمار ہیرے جواہرات اور شالیں شامل تھیں، قندہار لے کر آیا تو احمد شاہ نے خزانے پر قبضہ کر لیا، سارے کا سارا اپنی فوج کے سرداروں، سالاروں، سپاہیوں، حکومتی عہدے داروں اور ملازموں میں تقسیم کر کے عالی ظرفی اور دریا دلی کا مظاہرہ کیا۔ احمد شاہ کا بحیثیت انسان مقام اتنا بلند ہے کہ اس کے سامنے سونا، چاندی، ہیرے

جواہرات کی کوئی حیثیت نہیں تھی اس نے مال و دولت سے کبھی محبت نہیں کی۔ 1761ء میں جب احمد شاہ نے پانی پت کے تاریخی میدان میں مرہٹوں کو شکست دی اور دہلی پر قبضہ کر لیا، تو احمد شاہ نے تاج و تخت عالمگیر ثانی کے پاس رہنے دیا، اگر احمد شاہ چاہتا تو خو ہندوستان کا بادشاہ بن سکتا تھا، مگر اس کے دل میں ایسی کوئی خواہش جنم نہیں لے رہی تھی، اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ احمد شاہ کا مقصد صرف جہاد تھا تاج و تخت یا دولت نہیں تھی۔ احمد شاہ ابدالی انسانیت کا کس قدر احترام کرتا تھا اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب پانی پت کی جنگ میں وسواس راؤ قتل ہوا تو احمد شاہ کے سپاہی اس کی لاش میں بھس بھر کر بطورِ یادگار افغانستان لے جانا چاہتے تھے، مگر احمد شاہ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا، اس نے پنڈت بلوائے اور شجاع الدولہ کی زیر نگرانی لاش باعزت طریقے سے جلائی اور راکھ سونے کے برتن میں ڈال کر پیشوا بالا جی باجی راؤ ثانی کو بھجوائی گئی، سارے اخراجات احمد شاہ نے برداشت کئے، بھاؤ کی لاش کو بھی تلاش کیا گیا، لاش ملی تو سر کے بغیر تھی، سر ایک سپاہی کے پاس تھا، اس کا منہ دھویا گیا، لاش برہمنوں کے سپرد کی گئی اور باعزت طور پر جلائی گئی، اس کی راکھ بھی سونے کے برتن میں ڈال کر پیشوا کو بھجوا دی گئی، ان واقعات سے احمد شاہ کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ الفنسٹن لکھتا ہے کہ احمد شاہ ہنس مکھ، شیریں زباں، ملنسار اور خوش مزاج تھا، حکومتی معاملات میں اپنی الگ شخصیت اور وقار قائم رکھتا تھا، مگر عام حالات میں اس کا رویہ عمدہ اور سادہ ہوتا تھا۔ احمد شاہ صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا، علما و درویشوں کی عزت کرتا، جہاں بھی جاتا بزرگوں کے مزار پر فاتحہ ضرور پڑھتا، پانی پت کی فتح کے بعد حضرت بو علی قلندر اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری دی۔ احمد شاہ رحمدل اور سخی بادشاہ تھے، اس نے پانی پت کی جنگ سے پہلے یہ اعلان کیا کہ ”افغانستان کے آدمیوں میں سے کوئی ہندوستان کے ہندوؤں کے خلاف تعصب کا اظہار نہیں کرے گا، کمزوروں پر ظلم و ستم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی کی مذہبی اور معاشرتی رسوم پر اعتراض کریں گے۔“ احمد شاہ باباؒ خدا پرست تھے اس لئے اس نے کورنش بجالانے یا اپنے سامنے جھکنے سے منع کر دیا۔

عشاء نماز کے بعد ہم محمد سلیمان کے گھر واقع حضرت جی بابا محلہ پہنچے، پر تکلف عشائیہ پیش کیا گیا، کافی دیر تک گپ شپ کرنے کے بعد ہم نے رخصت لیکر واپس عینو مینہ حاجی عبد اللہ صاحب کے گھر گئے جہاں عزیز اللہ جان سبز چائے تیار رکھے ہمارے آنے کا منتظر تھے۔ رات دیر تک ان کے ساتھ گپ شپ رہی، اور پورے دن کی تھکاوٹ کو دور کرنے کیلئے آرام کرنے بستر کو اپنالیا۔

13 جنوری 2023ء کو صبح ناشتہ کے بعد ہم قندھار سے صوبہ ذابل روانہ ہوئے اور تقریباً 12 بجے کے قریب صوبہ ذابل کے ہیڈ کوارٹر قلات پہنچے۔ قلات پہنچنے پر نائب گورنر مولوی محمد سلیمان آغا کو فون کیا چونکہ جمعہ کا دن تھا اس لئے تعطیل کی وجہ سے دفاتر بند تھے اور مولوی محمد سلیمان آغا بچوں کے ہمراہ کہیں گئے ہوئے تھے اس لئے ملاقات نہ ہو سکی انہوں نے اپنے عملے کو گورنر ہاؤس کے ریسٹ ہاؤس میں ہمارے لئے رہائش کے بندوبست کا بتایا تھا لیکن ہم نے ان کے ساتھ صرف چائے نوشی کے بعد رخصت لیکر واپس دو تین دن بعد آنے کا کہا۔ قلات مرکز سے ہم ضلع شینکئی Shinkay روانہ ہوئے، پورے راستے میں برف کا سفید چادر بچا ہوا تھا، 30 تا 35 کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے بعد "سور غر" کے نام سے مشہور پہاڑی سلسلہ شروع ہوا، اس علاقے کو پشئی بند کہا جاتا ہے، یہاں سے کچی سڑک شروع ہوئی ہم نے گاڑی سائیڈ پر لگا کر برف میں تصاویر لی، جوں ہی ہم گاڑی میں بیٹھنے لگے تو پروفیسر ڈاکٹر عبد العلی صاحب برف میں پھسل گئے اور پاؤں میں سخت درد محسوس کرنے لگے، تھوڑا سا آگے جا کر ایک فیملی بچوں کے ہمراہ سخت سردی اور برف میں پیدل جا رہی تھی، بچوں کو ساتھ دیکھ کر ہم نے خواتین و بچوں کو اپنی گاڑی میں بٹھا دیئے لیکن تھوڑا سا آگے جا کر زیادہ برف کی وجہ سے ہماری گاڑی بھی پھسلنے لگی، کچھ اور گاڑیاں بھی پھسلن کی وجہ سے

کھڑی تھیں۔ یہاں ظہر نماز کا وقت بھی تھا، سردی اور برف بھی شدید تھی اور ارد گرد آگے جانے کیلئے کوئی وسیلہ بھی نہیں تھا۔ آخر کار طالبان آرمی کے دو 4x4 گاڑیاں آئیں جنہوں نے خواتین و بچوں کو اپنی گاڑیوں میں بٹھا کر گھروں تک پہنچانے اور روڈ کھولنے کیلئے بلڈوزر کے آنے کا بتایا۔ آدھا گھنٹے تک بلڈوزر بھی پہنچا اور راستے کو صاف کرتا رہا، یہاں ہمارے 3 گھنٹے لگے، پانی کا کوئی نام ونشان نہیں تھا اور اوپر سے برف و شدید سردی تھی لہذا میں نے تو گاڑی میں ہی تیمم کر کے سیٹ پر ہی ظہر نماز پڑھی اور ڈاکٹر عبد العلی صاحب تو گاڑی سے اتر گئے تھے ان کا علم نہیں کہ کس حالت میں انہوں نے نماز ادا کی ہو گی۔ بہر حال پہاڑی سلسلہ کے ختم ہونے پر عصر کے نماز کا آخری وقت تھا میں نے پھر تیمم کر کے برف کے اوپر چادر بچھا کر نماز ادا کی اور آگے کو چل دیئے۔ کوئی 10 کلومیٹر کے بعد ہم ضلع شینکئی کے بازار "تمیر" پہنچے، مغرب کے آذان کا وقت تھا، سخت سردی تھی، بازار مکمل بند تھا، ایک موٹر سائیکل سوار ملا جس سے میں نے حاجی بانور مامک کے گھر کا پوچھا (حاجی بانور مامک میرے والد صاحب کے نانا حاجی نیاز محمد خان کے بھتیجے ہیں، بانور مامک کے مطابق اس وقت ان کا عمر 100 سال سے اوپر ہے)۔ موٹر سائیکل سوار نے ہمیں حاجی بانور مامک کے گھر تک پہنچایا۔ مغرب کی نماز ہو گئی تھی، ہم نے دروازہ کھٹکایا تو بچے باہر آئے، میں نے بچوں کو اپنا تعارف کراتے ہوئے بھیٹک کھولنے کا کہا، بچے واپس گھر گئے اور فوراواپس آکر اندر گھر آنے کا کہا، ہم نے گھر کے اندر جاکر مغرب نماز ادا کی، اس دوران حاجی بانور مامک کے دوسرے بیٹے خان محمد بھی آئے اور اپنے چچازاد مولوی باز محمد کو فون کر کے ہمارے آنے کا کہا اور انہیں بھی بلایا اور پھر سبز چائے پر حال احوال شروع ہوا یہاں تک کہ ہمارے سامنے رات کے کھانے کا دستر خوان بچھایا گیا اور مشہور قبائلی ڈش "لاندی" (سوکھی گوشت اور اس کے شوربہ) سے ہماری خاطر تواضع کی گئی۔ (مولوی باز محمد جو مولوی باز گل کے نام سے مشہور ہیں، 1983ء میں نوحصار ضلع کوئٹہ میں میرے والد صاحب کے شاگرد تھے۔ 5 سال میرے والد صاحب کے ساتھ رہے اور بالاخر جامعہ مظہر العلوم شالدرہ کوئٹہ سے دستار بندی کر کے سند فراغت حاصل کی)۔ دن بھر کی شدید سردی جھیلنے اور سخت تھکاوٹ کو دور کرنے کیلئے آرام کرنے بستر کو اپنالیا، اور مزے کی نیند سوئے۔

14 جنوری 2023ء کو صبح ناشتہ کے بعد ہم خان محمد اور مولوی باز محمد کی معیت میں شینکئی سے اپنے آباء واجداد کے رہائشی علاقوں کو دیکھنے کی طرف نکل گئے۔ شینکئی کے بعد "لوڑگئی Lorgay" کا علاقہ شروع ہوتا ہے جو اب ضلع نوبہار کا حصہ ہے۔ یہاں سب سے پہلے گاؤں "**ملکیزی** Malakezi" آتا ہے جہاں میرے والد صاحب کے پردادا **سید مولانا محمد یار آتش نفس** رحمہ اللہ کا مسجد، خانقاہ اور گھر تھا، اسے پرانا خانقاہ یا ملکیزی خانقاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (سید مولانا محمد یار آتش نفس رحمہ اللہ بڑے عالم فاضل اور وقت کے ولی اللہ گزرے ہیں۔ آتش نفس-aatish-nafs کا لفظی معنی ہے: سوختہ جگر، صاحب سوزوگداز۔ کہا جاتا ہے کہ جب آپؒ حالت سکر میں ہوتے تو آہ سے آگ بن جاتی۔ آپؒ 1281 شمسی بمطابق 1902ء کو بیت اللہ میں وفات پا کر مکہ مکرمہ جنت المعلی میں مدفون ہیں، آپ سلسلہ نقشبندیہ کے معروف شیخ سید مولانا محمد یعقوب چرخیؒ کے پڑپوتے اور میرے والد صاحب کے پردادا ہیں۔ والئی افغانستان امیر عبد الرحمن خان[9] نے آپؒ کو درخواست کی تھی کہ آپؒ کابل میں رہ کر افغان فوج کی روحانی تربیت کریں چنانچہ آپؒ دوسال تک کابل میں رہے جہاں آپؒ کے نام سے منسوب مسجد کابل یونیورسٹی کے علاقے میں (مسجد صاحب آغاؒ) آج بھی موجود ہے۔ آپؒ اور آپ کے اولاد کو افغان حکومت (امیر عبد الرحمن خان) کی جانب سے "صاحبزادہ" لقب دیا گیا ہے۔ والئی افغانستان امیر عبد الرحمن خان کے بیٹے اور غازی امان اللہ خان کے والد امیر حبیب الرحمن خان[10] کے دور سلطنت میں سید مولانا محمد یار آتش نفسؒ کے اولاد کے لئے ایک شاہی فرمان (اعزازی و ٹیکس معافی خط) جاری کیا گیا جس میں لکھا گیا ہے کہ: آپؒ کا خاندان ہر قسم

کے ٹیکس و سرکاری مالیہ سے مبرا ہیں، ریاست کے کسی بھی حصے میں انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچایا جائے بلکہ ہر قسم کی مدد کی جائے، مزید یہ کہ اس خاندان سے دعا لی جائے اور ان کے بد دعا سے اپنے آپ کو بچائیں)۔

اس وقت "ملکیزیMalakezi" میں سید مولانا محمد یار آتش نفسؒ کا صرف مسجد موجود ہے جبکہ خانقاہ کے اب صرف آثار موجود ہیں۔ یہاں کا جو جائیداد ہے وہ میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے چھوٹے بھائی سید جیلانی آغاؒ عرف آغا کاکو، کے اولادوں کے حصے میں آیا تھا اور میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ یہاں سے دوسرے علاقے کرم قلعہ شفٹ ہو گئے تھے۔ یہاں میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے چھوٹے بھائی سید جیلانی آغاؒ کے قبر پر حاضری دی اور دعا کی۔ ((سید جیلانی آغاؒ عرف آغا کاکو کے مخلصین و مریدین افغانستان کے علاوہ لورالائی، میختر اور کاکڑ خراسان کے علاقوں میں موجود ہیں اس لئے سید جیلانی آغاؒ عرف آغا کاکو اپنی زندگی میں اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ آپؒ کے وفات کے بعد آپؒ کے بیٹوں سید گل احمد آغاؒ عرف گل آغا، سید نور احمد آغاؒ اور سید بہاؤ الحقؒ عرف کشنئ لالا نے مستقل طور پر لورالائی میں دوسڑک کے مقام پر اپنا رہائش اختیار کیا))۔ ملکیزی سے ہم قریبی گاؤں "بابو" گئے۔ بابو کے علاقے میں ایک مشہور علمی شخصیت مولانا پیر محمد اخندزادہ گزرے ہیں جو بابو اخندزادہ کے نام سے مشہور تھے، جن کے بڑے صاحبزادے مولوی احمد جان بھی اپنے وقت کے مشہور عالم تھے اور منطق کے اہم درسی کتاب ایساغوجی پر "نکتہ وحاشیہ" بھی لکھ چکے ہیں۔ یہاں سے آگے ہم لٹک قلعہ گئے جہاں ہمارے رہبر مولوی باز محمد کے بڑے صاحبزادے مسجد کے امام تھے۔ مولوی باز محمد نے یہاں میرے اور پروفیسر ڈاکٹر عبد العلی اچکزئی صاحب کے لئے سوٹ لیکر اپنے بیٹے کو سلائی کے لئے دیئے اور ہم یہاں سے ملحقہ علاقہ "لوئی شیخو" اور اس کے بعد "کشنئ شیخو" گئے۔ کشنئ شیخو میرے والد صاحب کے ننھیال کا علاقہ ہے۔ میرے والد صاحب کی پیدائش 1939ء بمطابق 1359ھ میں اسی کشنئ شیخو میں اپنے ننھیال میں ہوئی ہے جہاں میرے دادا "سید خواجہ احمد آغاؒ" کشنئ شیخو کے مسجد میں امام تھے۔ وہ گھر بھی دیکھا جہاں میرے والد صاحب کی پیدائش ہوئی تھی، اب تو کمروں کے صرف آثار باقی تھے جبکہ حویلی / چاردیواری میں باغ لگایا گیا تھا۔ یہاں سے ہم اپنے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے علاقے کرم قلعہ گئے، یہ صوبہ زابل کے ضلع نوبہار (سابقہ ضلع شینکئ) کے علاقے غنڈان میں واقع ہے۔ (آپؒ ملکیزی خانقاہ / پرانے خانقاہ سے یہاں کرم قلعہ شفٹ ہو کر آئے تھے)، آپؒ کے دور میں بنایا گیا خانقاہ، مسجد اور گھر ویران ہو چکا تھا بلکہ اب تو آثار بھی باقی نہیں تھے، آپؒ کے بڑے بیٹے اور میرے دادا سید خواجہ احمد آغاؒ کے بڑے بھائی سید محمد ابراھیم جان آغاؒ عرف آغا لالا نے پرانے خانقاہ و گھر سے ذرا فاصلے پر نئی آبادی کی تھی اور وہیں پر مسجد، خانقاہ اور گھر بنایا تھا جو اب بھی موجود ہے اور سید محمد ابراھیم جان آغاؒ کا ایک فرزند سید نورانی آغا اور ایک پوتا سید فقیر اللہ آغا وہیں رہائش پزیر ہیں۔ یہاں پر میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے مرقد پر حاضری دی اور دعا کی، کچھ دیر تک عجیب کیفیت لاگو تھی اور ایک تصور میں گم تھے۔ ((آپؒ بڑے ولی اللہ، عالم فاضل اور وقت کے نامور شیخ تھے، آپؒ نے "حرز موسوی" کے نام سے 19ویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک تصنیف کی تھی جو آپؒ کے بھائی سید خیر الدین آغاؒ نے آپؒ کے ایک مرید و مخلص محمد حسین بن محمد صدیق کچھی میمن کے ذریعے 1340ھ بمطابق 1921ء میں (آج سے 102 عیسوی سال قبل) مطبع عبادی واقع کریل باڑی بمبئی سے پہلی مرتبہ شائع کیا۔ اس میں فقہی مسائل کے ساتھ تصوف و سلوک اور ذکر و اذکار کے حوالے سے رہنمائی موجود ہے، اس کے علاوہ ایک دوسری کتاب "لباب الالباب" تحریر کی ہے جو غیر مطبوعہ ہے اور آپؒ کے بھائی سید مولانا نور محمدؒ آغو جان صاحب کے ہاں موجود تھی جس کا ذکر سید بھائی جان

آغاؒ نے اپنی کتاب نار نور، مکتبہ بنوریہ، میکانگی روڈ، کوئٹہ، قلمی نسخہ 1369 شمسی میں بھی کیا ہے۔ آپؒ تقریبا78 سال کی عمر میں 1911ء بمطابق 1329ھ میں وفات پائے ہیں))۔ مزار مبارک پر فاتحہ خوانی کے بعد سید نورانی آغا کے ہاں سبز چائے اور کشمش وبادام پر حال احوال ہوا۔ سید نورانی آغا نے اپنے صاحبزادے کو کھانے کا اہتمام کرنے کا حکم دیا جسے ہم نے یہ کہہ کر روک دیا کہ کھانا آپ کے بھتیجے سید فقیر اللہ آغا کے ہاں کھائیں گے تاکہ ان کے پاس بھی حاضری کا حق ادا ہو، چنانچہ ہم نے سید فقیر اللہ آغا کو پیغام بھیجا کہ ہم آپ کے پاس کھانا کھانے آئیں گے۔ جیسے اوپر ذکر کیا تھا کہ "سورغر" کے علاقے پشئی بند میں پروفیسر ڈاکٹر عبد العلی صاحب برف میں پھسل گئے تھے اور پاؤں میں سخت درد محسوس کرنے لگے تھے اس لئے یہاں سے کچھ فاصلے پر موجود علاقے "چھتری" میں ایک عطائی ہڈی جوڑ والے بابے "نورزئی کاکو" کے طرف چلے گئے ،وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہاں میرے داداجان "سید خواجہ احمد آغاؒ" کے ایک بھتیجے اور سید محمد ابراہیم جان آغاؒ کے بیٹے سید مولوی فخر الدین آغا کا گھر ہے چانچہ پہلے ان کے پاس حاضر ہوئے، حال احوال میں میرے والد محترم سید مولانا عبد الاحد آغا کے متعلق بہت پوچھتے رہے، والد صاحب کی بہت تعریفیں کی، ان کے شجاعت، سخاوت اور علمیت کے بہت معترف تھے، مجھے دیکھ کر کہا: آپ کی آنکھوں کو دیکھ کر عبد الاحد جان یاد آیا، اور کہا کہ عبد الاحد جان کو دیکھے ہوئے تقریبا60 سال تو ہوگئے ہیں۔ بہر حال ظہر نماز کا وقت ہونے کے بہانے دعالیکر رخصت لی۔ ان کے گھر سے نکل کر داداجان "سید خواجہ احمد آغاؒ" کے دوسرے بھتیجے اور سید محمد ابراہیم جان آغاؒ کے بیٹے سید سعد اللہ آغاؒ (جو اب فوت ہوچکے تھے) کے بیٹوں کا گھر تھا ان کے ہاں ظہر نماز ادا کر کے چائے پی لی، دونوں گھروں میں کھانے کے لئے اصرار کیا گیا لیکن ہم نے سید فقیر اللہ آغا کے ساتھ کھانے کا کہہ کر رخصت لیا اور عطائی ہڈی جوڑ والے بابے "نورزئی کاکو" کے پاس چلے گئے جس نے ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے پاؤں کو اپنے طریقے الٹا سیدھا کر کے پلستر لگایا اور کپڑے سے باندھ کر ایک ہفتہ بعد کھولنے کا کہا۔ یہاں سے ہم واپس کرم قلعہ سید فقیر اللہ آغا کے گھر آئے، انہوں نے کافی انتظار کیا تھا چنانچہ فوری طور پر کھانا "مشہور قبائلی ڈش لاندی" پیش کیا گیا، بھوک اور تھکاوٹ کی وجہ سے خوب کھایا اور عصر نماز یہیں ادا کر کے ان سے رخصت لی، اور واپس شیخو کے راستے لٹک قلعہ آئے جہاں ہم نے مغرب کی نماز ادا کی۔ آج کا دعوت مولوی باز گل صاحب کے ہاں تھی لہذا یہاں بھی رات کو مشہور قبائلی ڈش "لاندی" کا پروگرام تھا۔ رات دیر تک مختلف علمی، علاقائی سیاست اور قہقہوں کی گونج میں پرانی یادوں پر مشتمل گپ شپ رہی۔

سید مولانا محمد یار آتش نفسؒ کے 10 بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے بیٹے سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ (میرے پردادا) تھے۔ سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے تین بیٹے تھے، بڑے بیٹے کا نام سید محمد ابراہیم جان آغاؒ عرف آغا لالا، دوسرے بیٹے (میرے دادا) کا نام سید خواجہ احمد آغاؒ اور تیسرے بیٹے کا نام سید محمد نعیم آغاؒ ہے، تینوں بھائی الگ الگ والدہ سے تھے۔ سید محمد ابراہیم جان آغاؒ عرف آغا لالا کے گھر اور خاندان کے حوالے سے اوپر مختصر بحث کی گئی ہے، جبکہ چھوٹے بھائی سید محمد نعیم آغاؒ کا ایک ہی بیٹا ہے مولوی سید نور آغا جو جید عالم دین اور مدرس عالم ہیں اور اس وقت لورائی میں اپنا مسجد، خانقاہ اور مدرسہ رکھتے ہیں۔ ان کے والد سید محمد نعیم آغاؒ کا مزار بھی لورالائی میں بلوچستان ریزیڈنشل کالج کے قریب بطرف شہر موجود ہے۔ میرے دادا سید خواجہ احمد آغاؒ اپنے والد سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے وفات سے قلیل مدت قبل 1909ء بمطابق 1327ھ میں پیدا ہوئے تھے اور اپنے بڑے بھائی سے عمر میں کافی چھوٹے تھے۔ یتیمی اور اپنے بڑے بھائی کے زیر عتاب والی زندگی گزاری۔ جیسے اوپر ذکر کیا کہ میرے والد صاحب کی پیدائش 1939ء میں کشنئی شیخو میں اپنے ننھیال میں ہوئی ہے

جہاں میرے دادا "سید خواجہ احمد آغاؒ" کشنئی شیخو کے مسجد میں امام تھے۔ زمین اور جائیداد رکھنے کے باوجود داداجان دوسروں کے امامت کرنے پر مجبور تھے کیونکہ جائیداد وغیرہ پر بڑے بھائی نے قبضہ جمایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے دادا مدرس عالم اور صوفی منش تھے، باپ دادا کے مریدین و مخلصین کا رجحان داداجان کی طرف بہت زیادہ تھا، یہی بات ان کے بڑے بھائی کو پسند نہ تھی۔ کشنئی شیخو کے علاوہ داداجان نے قادر خیل (شینکئی) اور "نرئی تو" میں بھی امامت کی ہے۔ غربت، افلاس اور اپنے بھائی کے ظلم وزیادتی کے بناء داداجان نے تقریباً 1946ء میں افغانستان کو الوداع کہہ کر ہمیشہ کے لئے کوئٹہ آئے اور پرانا کلی اسماعیل و کلی شابو میں تاحیات رہے، جنرل محمد ضیاء الحق کے حادثہ سے محض 3 دن قبل اگست 1988ء میں وفات پاکر کلی پائند خان کوئٹہ میں مدفون ہیں۔ والد صاحب سید مولانا عبد الاحد آغا صرف 8 سال کی عمر میں افغانستان سے اپنی والدہ کے چچازاد بھائی مولوی نجم الدینؒ کے ساتھ بغرض تعلیم سنجاوی (سابق ضلع لورالائی اور موجودہ ضلع زیارت) آئے، بعد ازاں لورالائی، اورگس (مسلم باغ)، وچہ زامہ اور کان مہترزئی (مسلم باغ) کے علاوہ کوئٹہ و مختلف پشتون علاقوں کے مدارس ومساجد میں دینی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس دوران افغانستان کے مختلف علاقوں کابل، چرخ، قلات وغزنی میں بھی تعلیم حاصل کی لیکن سب سے زیادہ وقت غزنی کے علاقے "رامک" میں مولانا عبد العزیز اخندزادہؒ کے ساتھ گزارا۔ 1968ء میں وہاں جملہ فنون (صرف، نحو، فقہ اوراصول فقہ کے جملہ کتب، بلاغت میں مختصر المعانی، مطول وغیرہ، کلام میں شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، شرح مواقف، رسالہ میر زاہد وغیرہ، منطق میں قطبی، سلم العلوم، میر قطبی، صغریٰ و کبریٰ: میر سید شریف جرجانی، ایساغوجی وغیرہ، فلسفہ / حکمت میں ہدایۃ الحکمۃ، شرح ہدایۃ الحکمۃ (میبذی)، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ اور ریاضی میں خلاصہ الحساب، تحریر اقلیدس، تشریح الافلاک، رسالہ قوشنجیہ، شرح چغمینی وغیرہ، غرضیکہ خیالی، قاضی، حمد اللہ و غفور جیسے دقیق وعمیق کتب) کی تکمیل کے بعد دستار بندی کئے بغیر واپس اپنے گھر کوئٹہ آئے کیونکہ والد صاحب کا شوق تھا کہ دارالعلوم دیوبند جاکر دستار بندی کرلوں لیکن اس وقت پاکستان وانڈیا کے حالات انتہائی کشیدہ تھے اس لئے دیوبند انڈیا جانا ممکن نہ ہوا، اسی انتظار میں 2 سال تک کوئٹہ کے مختلف مساجد میں طلبہ کو فنون کی بڑی کتب کا درس دیتے رہے اسی دوران جامعہ دارالرشاد چمن پھاٹک کوئٹہ میں بھی مدرس رہے اور بالاخر 1971ء میں صوبہ سرحد جاکر ٹانک وکوہاٹ میں مختصر وقت گزارنے کے بعد ضلع صوابی میں مولانا حمد اللہ جانؒ (ڈاگئی مولانا صاحبؒ) کے ہاں ترجمہ قرآن کریم اور علم مناظرہ پڑھنے کے بعد اگلے سال 1973ء میں دیوبند ثانی جامعہ دارالعلوم اکوڑہ خٹک میں مولانا عبد الحقؒ کے ہاں دورہ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد واپس کوئٹہ آکر مختلف مساجد ومدارس میں درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ حاجی میاں خان مسجد ترین روڈ کوئٹہ، کلی کاسی چشمہ اچوزئی (جہاں 1979ء میں میری پیدائش ہوئی ہے)، کلی عمر اور کلی نوحصار میں امامت کے ساتھ ساتھ تشنگان علوم نبویہ ﷺ کا علمی پیاس بجھاتے رہے۔ 1992ء میں مولانا داد محمدؒ عرف حاجی باباؒ آف روانی کے ساتھ سلسلہ تصوف کے کھڑی میں منسلک ہوکر سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے اور اس وقت چاروں سلسلوں کے ماذون ہیں۔ 1989ء تاحال جمعیت روڈ خلجی آباد لنک سپنی روڈ کوئٹہ میں رہائش پزیر ہیں۔ اس دوران 2007ء میں جامع راحت القلوب وخانقاہ یعقوبیہ کی داغ بیل ڈالی اور یہیں پر علوم ظاہری وباطنی کے خدمات جاری رکھے ہوئے ہیں۔ میرے والد صاحب کل آٹھ بھائی تھے جن میں سے ایک بچپن اور دو جوانی میں فوت ہوگئے ہیں۔ والد صاحب (1) سید مولانا عبد الاحد آغا عرف لالک آغا کے علاوہ (2) سید مولوی سلطان محمد آغا (نواں کلی کوئٹہ میں رہائش پزیر ہیں، مسجد مدرسہ وخانقاہ رکھتے ہیں)، (3) سید احمد جان آغا عرف سپین آغا (بلیلی کوئٹہ میں رہائش پزیر ہیں)، (4) سید مولانا عبد الصمد آغا (کچلاک میں رہائش پزیر ہیں، مسجد مدرسہ

وخانقاہ رکھتے ہیں)، [5] سید عبد المتین آغا عرف سید ھاشمی آغا (نواں کلی کوئٹہ میں رہائش پزیر ہیں، مسجد و مدرسہ رکھتے ہیں) [6] سید جان محمد آغاؒ 1979ء میں زمانہ طالبعلمی کے دوران غزنی میں روسی افواج کے ہوائی بمبار میں شہید ہوگئے تھے، جبکہ [7] سید بخت محمد آغاؒ 1997ء میں ایک اچانک حادثاتی واقعہ میں شہید ہوئے۔ والد صاحب کے بشمول تمام بھائی اپنی بساط کے مطابق دینی خدمات سرانجام دینے میں مصروف عمل ہیں۔

یہاں اس بات کو برملا کہنے میں کوئی عار، خوف یا شک محسوس نہیں کرتا کہ: بہت ہی اچھا ہوا کہ داداجان "سید خواجہ احمد آغاؒ" افغانستان سے کوئٹہ شفٹ ہوئے۔ کیونکہ یا تو ہم آج [1] جاہل ہوتے یا پھر [2] پڑھے لکھے جاہل۔ [3] دوفٹ زمین کے لئے لڑتے جھگڑتے اور مارتے مرواتے یا پھر [4] آباءواجداء کا نام استعمال کرتے ہوئے تعویذ گھنڈے کے کاروبار کو وسعت دیتے۔ [5] دم و تعویذ لینے والوں کو مرید کا نام دیتے یا [6] ان کے نذرانوں پر لڑتے جھگڑتے۔ [7] علم و تصوف، شریعت و طریقت، علوم شرعی و فنون عصری سے ناواقف ہوتے اور آغا و صاحبزادہ کا لقب بمعہ آباءواجداء کے نام کا ہتھیار لئے ہاتھوں کی چوما چمٹی ہوتی۔ [8] دہشت گرد ہوتے یا دہشت گردی کے بھینٹ چھڑتے، وقس علیٰ ھذا، اس کا ذکر اس لئے کیا کیونکہ یہ سب وہاں چل رہا ہے۔ شاید اسی ہجرت میں اللہ تعالیٰ کا راز پوشیدہ تھا اور داداجانؒ کے اولاد کو مزید کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنا تھا، اگرچہ آبائی وطن چھوڑنا اور کہیں اور جا کر آباد ہونا انتہائی مشقت اور بے بسی والی زندگی ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہاں آکر داداجانؒ کے تمام اولاد نے پڑپوتوں تک دن دگنی رات چگنی علمی، معاشی و معاشرتی ترقی کی ہے، البتہ انسان کمزور ہے خامیاں و کوتاہیاں انسان سے ہوتے رہتے ہیں لیکن مجموعی اعتبار سے داداجانؒ کے اولاد کا نام دینی و علمی خدمات کے اعتبار سے روز روشن کیطرح عیاں ہے

15 جنوری 2023ء کو صبح ناشتہ کے بعد ہم خان محمد اور مولوی باز محمد کی معیت میں شینکئی سے واپس قلات کیلئے روانہ ہوئے۔ جاتے ہوئے راستہ برف سے صاف کیا گیا تھا اور کوئی مشکل پیش نہ آیا۔ قلات سے 10، 15 کلومیٹر قبل ضلع سیوری کے علاقے عمرزئی میں طالبان رہنما امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاھدؒ کے مزار چلے گئے۔ مین روڈ "سیوری" سے "عمرزئی" مزار تک ہنگامی بنیادوں پر تقریبا 9 کلومیٹر کا روڈ بنایا گیا تھا، جس پر اب بھی کام جاری تھا، سیدھا جا کر قبر پر حاضری دی اور دعا کی۔ یہاں سخت سیکورٹی کا انتظام تھا، قبر کے احاطے میں تصویر اور ویڈیو کی ممانعت تھی۔ مزار کے ساتھ ہی ہنگامی بنیادوں پر زائرین کیلئے مسجد، کمرے اور لنگر بنایا گیا تھا، ہم جوں ہی مزار سے نکلے تو ایک اہلکار نے کھانے کا پوچھا، ہم نے بھی ہاں کردی لہذا دور کا مہمان سمجھ کر ہمیں خواص کے کمرے لیجا کر فورا کھانا پیش کیا گیا۔ کھانے کے بعد ہم نے یہیں ظہر نماز ادا کی اور قلات کیلئے روانہ ہوئے۔ عصر کے وقت قلات پہنچے اور قلات شہر کا نظارہ کیا۔ مغرب سے قبل میرے داداجان کے چچازاد بہن کے بیٹوں (حاجی عبد الحئ اکبری، حاجی ننگیالئی کاکڑ بن حاجی محمد اکبر کاکڑ) کے کاروان سرائے ملنے گئے، مغرب نماز یہیں ادا کی، سبز چائے سے تواضع کے بعد حاجی عبد الحئ اکبری نے اپنے بیٹے سے کہا کہ یہ پاکستان سے آئے ہوئے آپ کے ماموں ہیں لہذا ان کیلئے پاکستانی چائے دودھ پتی بناؤ، ہم نے بھی کافی دنوں سے دودھ پتی نہیں پیئے تھے لہذا یہ اچھا موقع ملا۔ (حاجی محمد اکبر کاکڑ سنزرخیل میرے پردادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے چھوٹے بھائی سید جیلانی آغاؒ کے داماد تھے۔ جن کا آبائی علاقہ دراصل قلعہ سیف اللہ ہے اور اب بھی ان کا جائیداد ضلع قلعہ سیف اللہ، بلوچستان میں موجود ہے، نامعلوم وجوہ کی بناء پر وہ افغانستان قلات شفٹ ہوگئے تھے اور آج تک وہیں کے ہوگئے ہیں)۔ ان کے ساتھ کافی دیر تک گپ شپ کے بعد رخصت لیکر میرے دادا سید خواجہ احمد آغاؒ کے بڑے بھائی سید محمد ابراھیم جان آغاؒ عرف آغا لالا کے پوتے سید عبد الاحد آغا بن سید غوث الدین آغاؒ (جو میرے والد صاحب کے ہم نام ہیں) کے گھر گئے، ان کو ہم نے پہلے ہی اپنے آنے سے آگاہ کیا تھا چنانچہ رات کو یہیں پر رہے۔

16 جنوری 2023ء کو صبح ناشتہ کے بعد میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے چھوٹے بھائی سید سرور جان آغاؒ کے پوتے اور سید سلام جان آغا شہیدؒ کے بڑے بیٹے سید عبد الصمد آغا کے فاتحہ خوانی کے لئے ان کے گھر گئے جو دو ہفتے قبل انتقال کر گئے تھے، چنانچہ ان کے بھائی سید فتح الرحمن آغا سے تعزیت کی اور حال احوال لینے کے بعد ان سے اجازت لے کر ہم دوبارہ قلات شہر کو دیکھنے نکلے اور مختلف مقامات کا وزٹ کیا۔ دوپہر کو ایک قبائلی رہنما حاجی عبد اللہ خان کے گھر گئے، (حاجی عبد اللہ خان، میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے چھوٹے بھائی سید جیلانی آغاؒ کے نواسے ہیں۔ حاجی عبد اللہ خان کے والد حاجی شیخ یعقوب اور بڑے بھائی وکیل بسم اللہ خان اپنے قوم ہوتک کے سربراہ تھے، افغانستان میں وکیل ممبر پارلیمنٹ کو کہا جاتا ہے، چونکہ بسم اللہ خان اس وقت ممبر پارلیمنٹ تھے اس لئے اسے وکیل کہا جاتا تھا۔ حاجی شیخ یعقوب اور ان کے بیٹے وکیل بسم اللہ خان کو 1979ء ثور انقلاب کے دوران روسیوں اور ان کے ہم نواؤں نے بمعہ چند دیگر سرکردہ افراد کے زندہ لے جاکر لاپتہ کیا اور آج تک ان کے لاشوں وقبور کا بھی معلوم نہیں)۔ ظہر نماز یہیں ادا کی اور پر تکلف کھانا پیش کیا گیا، کافی دیر تک حال احوال اور علمی وسیاسی مجلس کے بعد ان سے رخصت لیکر قلات بازار میں اپنی گاڑی کا کچھ کام کیا، موبل آئل چینج کرنے اور گاڑی سروس کرنے کے بعد حاجی بانور مامک کے بڑے بیٹے اور مولوی باز گل کے چچازاد بھائی عبد الحلیم کے ہاں گئے، عبد الحلیم بھی میرے والد صاحب کے شاگرد رہے ہیں اور بچپن میں نوحصار کوئٹہ میں والد صاحب کے ہاں پڑھتے تھے، آج رات کی دعوت ان کے ہاں تھی، پر تکلف عشائیہ کے بعد واپس اپنے کل والے ٹھکانے یعنی سید عبد الاحد آغا کے گھر گئے اور رات وہیں پر گزاری۔

17 جنوری 2023ء کو صبح ناشتہ کے بعد صوبہ ذابل کے مرکز قلات میں ولایت مقام (گورنر ھاوس) گئے، جہاں نائب گورنر مولوی سلیمان آغا سے ملاقات کی، پہلے عشائیہ کے لئے بہت تاکید کی چونکہ ہمارا سفر آگے باقی تھا اس لئے معزرت کیا، پھر ظہرانے کے لئے تاکید کی لیکن ہم نے دیر ہونے اور اگلے مقام تک نہ پہنچنے کی بناء پر واپسی کے وعدے پر اجازت لیکر عصر کو صوبہ غزنی کے ضلع مقر پہنچے، جہاں میرے ننھیالی رشتہ دار محمد کریم وغیرہ ہوتے ہیں، ان سے فون پر بات ہوئی اور اپنے آنے کی اطلاع دی، یوں وہ ہمارے منتظر تھے، چنانچہ عصر نماز سے قبل ہم ان کے گھر پہنچے، مشروبات وماکولات سے خاطر تواضع کے بعد عصر نماز ادا کی اور علاقہ کو دیکھنے چھل قدمی کرتے ہوئے کافی دور تک گئے، اس دوران محمد کریم ہمیں پرانے قلعے، خاندانی جائیداد، پون صدی سے زائد عرصے کے بعد واپس مخالفین سے چھیننے والی زمین ودیگر جائیداد کی تفصیلات بتاتے ونشاندہی کرتے رہے، یوں مغرب آذان سنائی دی لہذا ہم واپس طوطی خان کے پوتے، حاجی نوروز خان کے بھتیجے محمد کریم کے قلعہ واپس ہوئے۔ رات کو شاہی شان کے مطابق عشائیہ اور پھر اگلے دن اسی طرح کا ناشتہ پیش کیا۔ یہ بات حقیقت ہے کہ بڑے گھر جتنے بھی تباہ ہو جائیں لیکن ان کا شاہی طبعیت اور مہمان نوازی میں کوئی فرق نہیں آتا جس کا مشاہدہ ہم نے یہاں کیا۔ (میری والدہ مرحومہ کے پر دادا اور خان طوطی خان، افغانستان کے سابق شاہ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ کے دور حکومت میں باغی کمانڈر تھے، یہ بغاوت بھی اپنوں کی وجہ سے کرنی پڑی۔ طوطی خان چونکہ زیرک شخصیت اور جرگہ وغیرہ کے ماہر تھے لہذا ان کے رشتہ داروں کو طوطی خان کا یہ ادا پسند نہیں تھا اور انہیں خوف لاحق تھا کہ اس طرح سے طوطی خان حکومت کے نظروں میں آکر ہمیں پیچھے دھکیل دے گا، لہذا انہوں نے حکومت کی نظروں میں طوطی خان کو غدار قرار دیا۔ طوطی خان کے متعلق مشہور ہے کہ حکومت وقت نے انہیں زندہ یا مردہ گرفتاری پر انعام مقرر کیا تھا، لیکن چونکہ ان کی گرفتاری ناممکن تھی اس لئے طوطی خان کے رشتہ دار جو حکومت وقت کے قریبی اور اعتماد یافتہ تھے، نے انعام وصولی کے لالچ میں طوطی خان

کے ہم شکل کسی معصوم کو پکڑ کر حکومت وقت کے حوالے کیا۔ کابل میں ان پر مقدمہ چلا اور ان کے لئے سر عام پھانسی کی سزا مقرر کی۔ اس دوران طوطی خان کو پتہ چلا کہ میرے نام پر کسی معصوم کو انعام کی لالچ میں پکڑ سزا دیا جارہا ہے، لہذا انہوں نے عین سزا والے دن گھوڑے پر سوار ہو کر بھرے میدان میں انٹری ماری اور گرجدار آواز میں میدان میں موجود اس وقت کے حاکم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ: "صاحب! صبر کریں، طوطی خان میں ہوں، آپ کسی بیگناہ کو پھانسی پر چڑھارہے ہیں۔ سب حیران ہوئے کہ یہ کیا ماجرا ہے، کہا جاتا ہے کہ ان کے رشتہ داروں میں جو ایک بڑے فسادی تھے وہ میدان سے فوری رفوچکر ہو گئے تھے۔ بہر حال سزا معطل ہوئی اور طوطی خان سے تفتیش شروع ہوئی، جب یہ ثابت ہوا کہ واقعی یہی اصل طوطی خان ہے تو حکومت وقت نے نہ صرف انہیں معاف کیا بلکہ شجاعت کے تمغہ (جسے افغانی مڈال کہتے ہیں) سے نوازا۔ پہلے سے پکڑے گئے بیگناہ کو مالی عوض کے ساتھ رہا کیا گیا چنانچہ وہی شخص بھی پھر طوطی خان کے گروپ میں شامل ہوا۔ حکومت نے طوطی خان کو وکیل (ممبر شوریٰ/پارلیمنٹ) بنایا۔ اس کے بعد طوطی خان نے اپنے علاقے ضلع مقر کے علاقے علی خیل میں برلب سڑک بہت بڑی قلعہ تعمیر کی جن کے آثار " قلعہ قندھاری فراری" کے نام سے اب بھی موجود ہیں۔ لیکن قلیل عرصے کے بعد 40 تا 45 سال کی عمر میں طوطی خان وفات پاگئے، ان کے وفات کے بعد ان کے رشتہ داروں نے پھر وہی پرانا وطیرہ اپنایا اور میرے نانا حاجی نوروز خان جس کی عمر اس وقت بمشکل 15 برس تھی کو تنگ کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ ان کے جائیداد پر بھی قبضہ کر لیا۔ میرے نانا نوروز خان کے 2 بھائی تھے، اشرف خان 13 سال اور جلات خان تقریبا 5 سال کے تھے۔ میرے نانا کا ایک چچا تھے جو عمر رسیدہ ہونے کے ساتھ بیمار بھی تھے لہذا انہوں نے نوروز خان کو اپنے علاقہ سے نکلنے کا کہا کیونکہ انہیں خوف تھا کہ کہیں ان کے رشتہ دار نوروز خان کو قتل نہ کرے۔ چنانچہ میرے نانا پوری فیملی کے ساتھ واپس قندھار فرار ہوئے جہاں ایک سال کے اندر ان کے چچا فوت ہوئے۔ چچا نے مرض الموت میں اپنے بھتیجے نوروز خان کو وصیت کی تھی کہ آپ یہاں سے شہاب الدین قلعہ جاکر سوتر علی خان کے پاس پناہ لیں، سوتر علی خان اور ان کے بڑے آپ کے والد کے اچھے دوست تھے شاید وہاں آپ امن سے رہیں، چنانچہ میرے نانا نوروز خان اپنے چچا کے کفن دفن کے بعد شہاب الدین قلعہ (جو صوبہ ذابل کا علاقہ ہے) گئے۔ سوتر علی خان نے نانا جان کو خوش آمدید کہا اور انہیں رہنے کے لئے گھر، کاشت کے لئے زرعی زمین کے ساتھ کھیتی باڑی کے لئے بیل، سواری کے لئے نسلی گھوڑا اور مال مویشی دیئے۔ یہ وہ اعلیٰ ظرفی ہے جس کا شاید موجودہ دور میں کوئی تصور نہیں۔ نانا جان نے اسی علاقے میں شادی کی۔ نوروز خان کے دل میں اپنے رشتہ داروں کے خلاف غصہ تو تھا ہی لہذا کچھ سنبھل کر اور دوسرے بھائی اشرف خان کے نوجوان ہونے پر یہیں سے وقتاً فوقتاً اپنے آبائی علاقے "علی خیل" ضلع مقر جاکر رشتہ داروں کے اموال وغیرہ کو نقصان پہنچانے کے لئے وارداتیں کرتے۔ ان کو کافی نقصان پہنچانے کے بعد نوروز خان نے اپنے بھائی اشرف خان سے مشورہ کیا کہ کہیں ہمارے دشمنی کی وجہ سے ہمارے محسنین سوتر علی خان کے فیملی کو نقصان نہ پہنچ جائے لہذا فیصلہ کیا کہ افغانستان سے فرار ہو کر کوئٹہ جاتے ہیں۔ اس طرح وہ شاہ ظاہر شاہ کے دور حکومت میں افغانستان سے کوئٹہ آئے (تقریبا 1943ء تا 1945ء کے دوران) اور کوئٹہ وجیکب آباد میں آخری ایام تک رہائش پزیر رہے۔ میرے نانا نوروز خان کے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا بسم اللہ جان تھے۔ بڑی بیٹی نوجوانی میں ہی فوت ہوگئی تھی، دوسری بیٹی میری والدہ تھی جو 2017ء میں وفات پائی اور تیسری بیٹی اب بھی حیات اور عمر رسیدہ ہے جبکہ بیٹا بسم اللہ جان ان کی زندگی میں نوجوانی میں اچانک بیمار ہو کر 22 سال کی عمر میں 1989ء میں وفات پائے۔ نوروز خان کے دوسرے بھائی اشرف خان مرحوم کا بھی کوئی اولاد نہیں تھا جبکہ تیسرے بھائی جلات خان مرحوم کے 5 بیٹے ہیں۔ حاجی نوروز خان

نے ساری زندگی مصائب و مشکلات، ذہنی اذیتوں اور دیار غیر میں گزار کر بالآخر اکلوتے نوجوان بیٹے کی موت کو نہ سہتے ہوئے 1993ء میں 78 سال کی عمر میں خالق حقیقی سے جا ملے اور کلی گل محمد ایئرپورٹ روڈ کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے)۔

18 جنوری 2023ء کو صبح ناشتہ کے بعد مقر سے غزنی گئے جہاں شہر سے 26 کلومیٹر کے مسافت پر تاجک قوم کے مشہور آبادی "رامک" میں وقت کے مشہور عالم دین مولانا عبد العزیز کی مسجد گئے (جو مسجد بابامیری سے مشہور ہے) اس وقت موجودہ طرز کے مدارس کا کوئی انتظام نہیں تھا بلکہ طلبہ مسجد سے متصل حجرے میں رہ کر علوم نبوی حاصل کرتے اور علاقے میں موجود تمام قریبی مساجد ایک ہی عالم کے دائرہ اختیار میں ہوتے اور وہ عالم اپنے شاگردوں کو مختلف مساجد میں تعینات کرتے، یہی شاگرد صبح یا دیگر اوقات میں اپنے استاد کے پاس حصول علم کے لئے آتے اور سبق پڑھ کر واپس اپنے مساجد و حجرہ جاتے۔ چنانچہ میرے والد صاحب ابتداء میں مولانا عبد العزیز اخندزادہؒ کی مسجد بابامیری میں رہائش پذیر تھے بعد ازاں مولانا عبد العزیز اخندزادہؒ کے مخلصین نے زگون مسجد کے نام سے مسجد تعمیر کی جس کا نام والد صاحب نے زیادہ مسجد رکھا تھا۔ میرے والد صاحب وہاں امامت بھی کرتے اور صبح کے اوقات میں مولانا عبد العزیز اخندزادہؒ کے پاس حاضر ہو کر درس حاصل کرتے ۔ میرے والد صاحب 7 سال تک رامک میں مولانا عبد العزیز اخندزادہؒ کے شاگرد رہے ہیں۔ بعد میں مولانا عبد العزیز اخندزادہؒ کویت جا کر وہاں کے شاہی امام مقرر ہوئے، عراق کویت جنگ کے دوران واپس پاکستان آئے۔ وفات کے بعد ان کے فرزندوں نے مولانا صاحب کی جسد خاکی غزنی لے جا کر سپرد خاک کیا۔ اس وقت ان کے اولاد میں سے کوئی وہاں موجود نہیں تھے البتہ ان کے گھر میں ہمسایہ رہائش پزیر تھے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا زگون مسجد کے ساتھ ہی گھر میں کھایا اور نماز ظہر کے وقت واپس غزنی پہنچ کر "روضہ" کے علاقے آئے، یہ علاقہ سلطان محمود غزنوی کے مزار کی مناسبت سے "روضہ" سے مشہور ہے۔ چنانچہ ہم سیدھا میرے پردادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے سب سے چھوٹے بھائی مشہور و معروف شخصیت و نامور شاعر **سید بہاؤالدین آغاؒ عرف بہائی جان آغا** کے مزار پر گئے، فاتحہ پڑھی اور دعا کی۔ آپؒ علم ظاہر و باطن کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری میں کمال درجے پر فائز تھے، شعر و شاعری کے 10 فارسی اور 8 پشتو زبان میں شائع شدہ کتب وراثت میں رکھتے ہیں۔ سید بہائی جان آغاؒ کی زندگی اور شاعری پر اب تک 44 تحقیقی کتب افغانستان و پاکستان میں شائع ہوئے ہیں اور اب بھی ان کی خدمات پر مختلف افراد و تحقیقی ادارے کام کر رہے ہیں۔ سید بہائی جان آغاؒ اپنے اشعار میں اپنا تعارف کراتے ہوئے یوں فرماتے ہیں کہ:

زما نوم بہائی جان دئ — اصل زائی زما غنڈان دئ
پہ نسب سید زادہ یم — پہ لقب صاحبزادہ یم
اوس می کوردئ پہ غزنی کی — پہ روضہ سلطانی کی
ما جوڑ کڑی دی جنابہ — پہ شمار لس اتہ کتابہ
لس فارسی نور افغانی دی — ٹول جہان کی نشانی دی

ترجمہ: میرا نام بہائی جان ہے، نسبا سید زادہ ہوں اور لقبا صاحبزادہ ہوں۔ میرا اصل وطن غنڈان ہے لیکن اب غزنی میں روضہ سلطانی میں رہتا ہوں۔ میں نے 18 کتاب تصنیف کئے ہیں جن میں 10 فارسی زبان اور باقی پشتو زبان میں ہیں۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:[11]

اسم سید بود بہاؤالدین | کہ تخلص بہائی جان دارد
ہاشمی زادہ در نسب عربی | بلکہ مشہور خاندان دارد
والد ماجدش محمد یار | نام آتش نفس عیاں دارد
بجناب محمد ﷺ عربی | گریہ عاصی بہائی جان دارد

چونکہ سخت سردی تھی اور گرم پانی کے بغیر وضو ممکن ہی نہیں تھا اس لئے مزار کے ساتھ ہی بہائی جان آغا کے گھر (جس میں اب ان کے پڑپوتے رہائش پزیر ہیں) گئے، جہاں مخلصین و معتقدین بڑی تعداد میں موجود تھے، ان سے تعارف کر کے گرم پانی کا طلب کیا لہذا فوراً ہی گرم پانی کا بندوبست کیا گیا، یہیں نماز پڑھ کر فوری طور چائے ولوازمات سے خاطر تواضع کی گئی، عصر سے قبل ہی رخصت لینا چاہا تو سید بہائی جان آغاؒ کے پڑپوتے سید مولوی جعفر آغا نے ہمارے جانے پر ناراضگی کا اظہار کیا اور رات ٹھہرنے کا اصرار کیا لیکن ہم نے واپسی کے وعدے پر رخصت لیکر اس کے بعد سلطان محمود غزنویؒ کے مزار پر حاضری دی اور دعا کی۔

سلطان محمود غزنوی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔یمین الدولہ ابو القاسم محمود ابن سبکتگین المعروف محمود غزنوی (2 نومبر 971ء-30 اپریل 1030) سلطنت غزنویہ کا پہلا آزاد حکمران تھا، اس نے 999ء سے 1030ء تک حکومت کی۔ ان کی موت کے وقت، اس کی سلطنت ایک وسیع فوجی سلطنت میں تبدیل ہو چکی تھی، جو شمال مغربی ایران سے لیکر برصغیر میں پنجاب تک، ماوراء النہر میں خوارزم اور مکران تک پھیلی ہوئی تھی۔ سلطان محمود زابلستان (موجودہ افغانستان) کے علاقے غزنی میں 2 نومبر 971ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد سبکتگین ایک ترک غلام کماندار (غلمان) تھے جنہوں نے 977 میں غزنوی سلطنت کی بنیاد رکھی، جس پر انہوں نے سامانیوں کے ماتحت کی حیثیت سے خراسان اور ماوراء النہر پر حکمرانی کی۔ محمود کی والدہ الپتگین کی بیٹی تھی۔ محمود کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہے۔ سبکتگین نے کو ساری جہاں نامی ایک عورت سے شادی کی اور ان کے بیٹے محمود غزنوی اور اسمعیل غزنوی تھے، جو ایک کے بعد ایک اس کا جانشین ہوا۔ محمود غزنوی کے بیٹے مسعود غزنوی اور محمد غزنوی تھے جو ان کے بعد اس کے جانشین مقرر ہوئے۔ محمود کا ساتھی جارجیائی غلام ملک ایاز تھا (سلطنت گجرات کی خلیج کھمبات کے دہانے پر بندرگاہ دیو کا گورنر اور امیر البحر تھا) اور ایاز سے ان کی محبت نے نظموں اور کہانیوں کو متاثر کیا[12]۔ سبکتگین کا انتقال 997ء میں ہوا اور اس کے بعد ان کے بیٹے اسماعیل غزنوی سلطنت غزنویہ کا حکمران بنا۔ سبکتگین کے زیادہ تجربہ کار اور بڑے محمود پر وارث کی حیثیت سے اسماعیل کی تقرری کے پیچھے کی وجہ معلوم نہیں۔ محمود نے جلد ہی بغاوت کر دی اور اپنے دوسرے بھائی ابو الظفر، لشکر گاہ کے گورنر کی مدد سے اگلے سال غزنی کی لڑائی میں اسماعیل کو شکست دی اور غزنوی سلطنت پر اپنا کنٹرول حاصل کر لیا۔ جب سبکتگین کی وفات اگست 997ء میں ہوئی تو اس وقت سلطان محمود اپنے باپ کی طرح سے نیشاپور کا حاکم مقرر تھا اور سلطان کا بھائی اسماعیل جو باپ کی وفات کے موقع پر غزنی میں موجود تھا، نے اپنے تاج پوشی کا اعلان کر دیا۔ سلطان محمود نے پہلے خط کتابت کے ذریعے بھائی اسماعیل سے بات کرنے کی کوشش کی جب کوئی حل نہ نکلا تو 998ء میں غزنی پر حملہ کر دیا۔ اسماعیل کی حکومت ختم کر کے خود غزنی کی سلطنت سنبھال لی۔

سلطان محمود جن کو اسلامی تاریخ کے چند عظیم جرنیلوں میں شامل کیا جاتا ہے، کی فوج کم و بیش ایک لاکھ تھی اور فوج میں عرب، غوری، سلجوق، افغان، مغل کے علاوہ دس سے پندرہ ہزار ہندو سپاہی بھی شامل تھے۔ ہندوستان سے جتنے بھی فوجی بھرتی کئے جاتے تھے۔ وہ بیشتر

ہندو ہوتے تھے۔ ان کا کمانڈر بھی ہندوستانی ہوتا تھا جس کو سپہ سالار ہندوان کہا جاتا تھا ہندو فوجی افسروں میں چند ایک قابل ذکر نام بیر پال، چک ناتھ، زناش، بجے راؤ اور سوھنی راؤ شامل تھے۔ عباسی خلیفہ نے 999ء میں سلطان محمود کو یمین الدولہ کا خطاب عطا کیا جس کی مناسبت سے سلطان محمود کے خاندان کی حکومت کو یمینی سلطنت بھی کہا جاتا ہے۔ محمود غزنوی نے ہرات کے قریب صحرا کنارے ایک خاص شہر، ہاتھی نگر، تعمیر کیا کہ ان خطوں کی گرم آب و ہوا ہندوستان کے موسموں سے مطابقت رکھتی تھی۔ پھر اس نے ہندوستان سے لائے ہوئے سینکڑوں ہاتھیوں کی پرورش اس شہر میں کی۔ ہاتھیوں کے ساتھ انہیں سدھارنے والے بھی ہندستان سے منگوائے گئے اور یوں ہاتھی اس شہر میں خوش وخرم ہو گئے۔ محمود ہر برس ان ہاتھیوں کی مدد سے ہندوستان پر حملہ آور ہوتا اور واپسی پر انہیں غزنی کی بجائے ہرات کے قریب اس ہاتھی نگر میں واپس بھیج دیتا تھا۔ سلطان محمود غزنوی جس کی سب سے بڑی وجہ شہرت ہندوستان پر سترہ حملے ہیں، کی بنیادی وجہ جان لینا انتہائی ضروری ہے موجودہ پاکستان کے علاقے لاہور سے پشاور تک کا علاقہ ایک ہندو راجہ جے پال کے زیر سلطنت تھا۔ جے پال اور سلطان محمود کے باپ سبکتگین کی ایک جنگ پشاور اور جلال آباد کے علاقوں میں 986ء میں ہوئی تھی، جس میں جے پال کو شکست ہوئی اور سبکتگین کی سلطنت دریائے سندھ کے ساتھ اٹک تک پھیل گئی تھی۔ سلطان محمود نے حکومت سنبھالتے ہی پشاور تک کے علاقوں میں چھوٹی چھوٹی مہمات کر کے اپنی سلطنت کو مضبوط کیا تو راجہ جے پال جو پہلے ہی اپنی شکست کا بدلہ لینے کو بے تاب تھا، نے ایک بڑا لشکر تیار کیا اور غزنی پر حملے کے لئے نکل پڑا۔ 1001ء میں پشاور کے قریب راجہ جے پال اور سلطان محمود کی فوجوں کا ٹکراؤ ہوا۔ راجہ جے پال کو شکست ہوئی اور پورے خاندان سمیت گرفتار ہو گیا۔ مذاکرات اور ایک بھاری تاوان کے عوض رہائی کے بعد جے پال واپس لاہور آیا، چونکہ لڑائی سے پہلے جے پال اپنے ارد گرد کے راجاؤں سے مدد لے کر گیا تھا اس لئے شکست کے بعد نہایت شرمندگی کی حالت میں اپنی حکومت بیٹے انند پال کے حوالے کر کے خود لاہور کے ایک دروازے کے پرانے برگد کے درخت کے پاس ایک بہت بڑی چتا جلائی اور جل مرا۔ سلطان محمود غزنوی نے دوسرا حملہ جو 1004ء کو ہوا۔ بھنڈا یا بھیرہ جو دریائے ستلج کے قریبی علاقوں پر مشتمل ریاست پر کیا جس کا راجہ بجی راؤ تھا۔ تیسرا حملہ ملتان کے حاکم ابوالفتح کے خلاف 1006ء میں کیا لیکن راستے میں ہی دریائے سندھ کے کنارے جے پال کے بیٹے انند پال کے ساتھ مڈبھیڑ ہو گئی۔ سخت جنگ کے بعد انند پال کو شکست ہوئی اور بعض روایات کے مطابق وہ کشمیر پناہ لینے کے لئے بھاگ گیا۔ انند پال کو شکست دینے کے بعد سلطان محمود نے ملتان کا رخ کیا اور ملتان کو فتح کرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ ملتان کا حاکم جے پال کے پوتے سکھ پال کو مقرر کیا جو اسلام قبول کر چکا تھا۔ جلد ہی سلطان محمود کو پھر ملتان جانا پڑا جہاں پر سکھ پال نے بغاوت کر دی تھی۔ 1008ء میں سلطان نے سکھ پال کو شکست دے کر معزول کر دیا۔ اسی دوران میں انند پال جو شکست کھا کر کشمیر بھاگ گیا تھا، نے واپس آ کر ایک بار پھر سلطان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انند پال نے ارد گرد کے راجاؤں سے مدد لے کر ایک بہت بڑا لشکر اکٹھا کر دیا۔ 1008ء کے آخری دنوں میں ایک بار پھر دریائے سندھ کے قریب اٹک کے علاقے میں جنگ کا آغاز ہوا۔ خونریز جنگ کے بعد انند پال کو ایک بار پھر شکست ہوئی۔ 1009ء کے آخری مہینوں میں ایک بار پھر سلطان محمود نے ہندوستان پر حملہ کر کے پہلے نرائن پور کی ریاست کو فتح کیا اور پھر 1010ء میں ملتان کے گردونواح کے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔ 1014ء میں سلطان نے انند پال کے بیٹے لوجن پال کو موجودہ کوہستان کے علاقے میں شکست دی اور مزید لوجن پال کی مدد کے لئے کشمیر سے آئے ہوئے ایک بڑے لشکر کو بھی شکست فاش سے دوچار کیا۔ 1015ء میں سلطان محمود نے کشمیر پر حملہ کیا اور لیکن برف باری کے باعث

راستے بند ہونے پر بغیر جنگ کے ہی واپس آنا پڑا۔ 1018ء میں سلطان محمود نے پہلی بار پنجاب کے پار دریائے جمنا کے علاقے میں اپنی فوج کو اُتارا اور ہندوؤں کے مذہبی مقام متھرا کو فتح کرنے کے بعد ایک مشہور ریاست قنوج کا محاصرہ کر لیا۔ قنوج کے راجے نے سلطان سے صلح کا پیغام بھیجا اور سلطان کا باجگزار بننا قبول کر لیا۔ 1019ء میں قنوج کی ملحقہ ریاست کالنجر کے راجہ گنڈا نے قنوج پر حملہ کر کے راجہ کو قتل کر دیا اس کی خبر جب سلطان محمود تک پہنچی تو وہ اپنے مطیع راجے کے قتل کا بدلہ لینے کیلئے نکلا اور کالنجر پر حملہ کر کے اسے شکست فاش سے دوچار کیا۔ راجہ لوجن پال اور راجہ گنڈا جو سلطان محمود سے شکست خوردہ تھے۔ دونوں نے مشترکہ طور پر ایک بڑے حملے کی تیاری کی اور ایک بار پھر 1019ء میں ہی سلطان کو دوبارہ ان دونوں کی سرکوبی کے لئے ہندستان کا سفر کرنا پڑا۔ نتیجتاً دونوں راجاؤں کو شکست ہوئی اور ہندوستان سے ہندو شاہی راجہ کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطان محمود غزنوی 1020ء سے 1025ء کے درمیانی عرصے میں سلطنت کے شمالی مغربی حصے اور دریائے فرات کی وادیوں میں فتوحات میں مشغول رہا۔ اسی عرصہ میں سلطان محمود کو اپنے مخبروں سے یہ اطلاعات متواتر مل رہی تھیں کہ شمالی اور وسطی ہندوستان کی تمام ریاستیں سلطان سے شکست کھانے کے بعد بدلہ لینے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی تھیں اور اب کے بار ایک مشترکہ حملہ کی تیاری تھی اس کیلئے گجرات کے علاقے کاٹھیاوار میں ایک بہت ہی مشہور مندر سومنات کو مرکز بنایا گیا ہے۔ جنگ کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں کہ سلطان نے پیشگی حملے کی تیاری کر دی۔ غزنی سے سومنات تک فاصلہ تقریباً 2600 کلومیٹر بنتا ہے جس میں سے 500 کلومیٹر طویل مشکل ترین صحرائے چولستان اور راجستھان بھی پڑتا تھا۔ اکتوبر 1025ء میں سلطان کی فوج تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ غزنی سے روانہ ہوئی۔ تین مہینوں کی مسافت کے بعد جنوری 1026ء میں سومنات مندر کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ ہندوستان کے طول و عرض سے مہاراجے اور راجواڑے اپنی اپنی فوج کے ساتھ مندر کی حفاظت کے لئے موجود تھے۔ جنگ کا آغاز ہوا اور ایک سخت مقابلے کے بعد سلطان محمود فتح یاب ہوا۔ مندر کو توڑ ڈالا گیا۔ یہی وہ مشہور جنگ ہے جس کی بنا پر بعض مورخین نے سلطان محمود کی ذات کو ایک لٹیرا مشہور کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سومنات کے بعد سلطان محمود کی ہندوستان پر آخری لڑائی 1027ء میں ہوئی جو دریائے سندھ سے دریائے بیاس کے درمیانی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اپنی آخری جنگی مہم 1029ء میں ایرانی علاقے رے میں انجام دی اور رے کے حاکم آل بویہ کو شکست دی[13]۔ آخری دو تین سال سلطان محمود غزنوی بیمار بھی رہا۔ کہا جاتا ہے کہ دق اور سل کے مرض میں مبتلا ہو کر 30 اپریل 1030ء میں 59 سال کی عمر میں غزنی میں وفات پائی۔

عصر سے قبل ہی غزنی سے نکل کر رات 9 بجے کابل پہنچے اور ریشخور کے علاقے میں نجیب اللہ بھائی کے گھر گئے جہاں پہلے سے ہی ان کے والد صاحب اور بھائی ہمارے انتظار میں تھے، پہنچتے ہی پر تکلف عشائیہ سے ہمارا اکرام کیا گیا۔ رات دیر تک محفل جاری رہا اور دن بھر کے تھکاوٹ کی بناء بستر تک پہنچتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر سوئے رہے۔

19 جنوری 2023ء کو صبح ناشتہ کے بعد کابل دیکھنے نکلے، اس دوران کابل ٹریفک پولیس کے ڈی آئی جی اور میرے شاگرد رحمت اللہ جان سے رابطہ ہوا جنہوں نے اپنا لوکیشن وٹس اپ کر کے ہم اسی کے مطابق ان کے پاس جامع عبد الرحمن چوک پہنچے۔ یہاں ان کے ساتھ حال احوال ہوئی اور زبردست قسم کے کافی و دیگر ماکولات سے ہماری خاطر تواضع کی گئی اور ہمیں کابل شہر کی سیر کرائی۔ شہر گھومنے کے بعد ظہر کی نماز مشہور جامع مسجد عبد الرحمن میں ادا کی اور پھر کابل کے تاریخی قبرستان شہدائے صالحین گئے جہاں دو صحابہ کرام حضرت تمیم انصاری اور حضرت جبیر انصاری رضی اللہ عنھما کے مزارات ہیں، فاتحہ خوانی کے بعد عصر نماز کیلئے کابل کے تاریخی و مشہور جامع مسجد پل خشتی گئے اور

مغرب نماز بھی یہیں پر ادا کی(پل خشتی مسجد کابل، افغانستان کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ پرانے کابل کے مرکز میں واقع، پل خشتی مسجد کو اس کے بڑے نیلے گنبد سے پہچانا جاسکتا ہے۔ یہ مسجد اصل میں 18ویں صدی کے آخر میں تعمیر کی گئی تھی، لیکن 1960 کی دہائی کے آخر میں ظاہر شاہ کے دور میں اس کی تعمیر نو کی گئی۔ اسے 1990 کی دہائی میں لڑائی کے دوران نقصان پہنچا تھا، لیکن 2019 تک اسے مکمل طور پر بحال کر دیا گیا ہے۔ "بہت سے کابلیوں کا دعویٰ ہے کہ 20ویں صدی کے اوائل میں کئی سالوں تک اس مسجد کا امام ایک انگریز تھا جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور یہ کہ امام مسجد میں اپنے عہدے سے دستبردار ہو کر انگلستان واپس آ گئے تھے"[14])رات کا دعوت طالبان رہنما ملا عبد المنان کے صاحبزادے رحمت اللہ جان کے ہاں تھی(جو کابل ٹریفک پولیس کے ڈی آئی جی اور میرے شاگرد ہیں)۔ چنانچہ ان کے معیت میں ان کے گھر گئے۔ پر تکلف عشائیہ کا اہتمام کیا تھا، رات دیر تک گپ شپ کرنے کے بعد ہم واپس ریشخور کے علاقے میں نجیب اللہ بھائی کے گھر گئے اور وہیں رات بسر کی۔

20 جنوری 2023ء کو صبح ناشتہ کے بعد کابل کے مشہور سرسبز علاقے پغمان کے سیر کو نکلے، یہ کابل سے 35-40 کلومیٹر کے مسافت پر واقع ہے، برف پوش پہاڑی علاقوں سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ ہر طرف برف ہی برف تھی، سیاح اس سرد موسم میں بھی کافی زیادہ تعداد میں آئے تھے جبکہ منچلے نوجوان برف میں کھیلتے ہوئے ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینک رہے تھے۔ پہاڑی سے نیچے اتر کر ذرا فاصلے پر ایک جامع مسجد گئے جو ابھی زیر تعمیر تھی، جمعہ نماز یہیں پڑھ کر ساتھ میں غازی امان اللہ خان کے یادگار کے طور پر بنے مینار کا نظارہ کیا۔ پغمان بازار کے مقامی ہوٹل میں یہاں کے ثقافتی کھانے سیخ کباب، قابلی پلاؤ کے ساتھ سبز چائے نوش کی، یہاں کھانا تازہ اور انتہائی سستا مل رہا تھا، سات بندوں کے کھانے کا 950 افغانی ہم سے لئے، جو ہمارے یہاں کے بنسبت انتہائی کم ہے، کھانے کا رقم لینے سے قبل ہم سے کہا گیا کہ خیر ہے آپ رقم ادا نہ کریں آپ مہمان ہیں، لیکن ان کی طرف سے مہمانداری کے اعزاز کو برقرار رکھتے ہوئے ہم نے ادائیگی کرلی۔ بلکہ اگر یہ کہوں کہ سارے افغانستان میں ہوٹلنگ معیاری اور سستا تھا، ہماری طرح وہ یہ نہیں دیکھتے کہ سیاح باہر کے اور ناواقف ہیں لہذا کھانا جتنی باسی کیوں نہ ہو اور جتنا دام چاہے بتائیں لے لیں گے۔ اسی دوران مجھے ہمارے یہاں کے مری کا واقعہ یاد آیا جب لوگ برف میں سردی سے مر رہے تھے اور ہمارے "شیر" رہائش و خوراک دس گنا بڑھا کر اپنی اصلیت کا ثبوت دے رہے تھے۔ اسلام و مسلمانی تو درکنار انسانیت کو ہی شرما دیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم نے یہاں موجود قصر پغمان کا سیر کیا جس کی عالی شان طرز تعمیر اپنے ہر ایک آنے والے کو متحیر ہی کر دیتا ہے۔ پغمان سے واپس کابل شہر کے درمیان میں واقع صحابی حضرت لیث ابن قیس ابن عباس رضی اللہ عنھم کے مرقد پر حاضری دی، یہ مزار شاہ دوشمشیرہ کے نام سے مشہور ہے۔ کابل کے مصروف مرکز میں گاڑیوں کے ساتھ پر ہجوم جگہ میں، کئی نئی اور پرانی عمارتوں کے ساتھ، ایک عمارت ہے جو دوسری عمارتوں سے بالکل مختلف ہے۔ کابل کے خشک سمندر کے قریب دو میناروں کے ساتھ ایک نیلے رنگ کا گنبد جو آنکھ کو اپنی طرف کھینچتا ہے کابل کی پہلی مسجد ہے۔ "شاہ دوشمشیر مسجد" ایک مسجد اور مزار ہے جس پر اکثر بدھ کے روز ہجوم رہتی ہے۔ شاہ دوشمشیرہ مسجد ایک تاریخی مقام ہے جس نے کابل کی شان میں اضافہ کیا ہے اور افغانستان کے حالیہ برسوں کی جنگ اور خانہ جنگی کے دوران اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے، یہ مسجد کابل کے قلب میں واقع ہے۔ مسجد کے داخلی دروازے کے دائیں جانب ایک تاریخی گولی نصب کی گئی ہے، اس مسجد کے ارد گرد کابل کے لوگوں کی نقل و حرکت کا مقام ہے۔ افغان مؤرخین کے مطابق یہ پہلا مزار ہے جہاں پہلا عرب شہید ہوا۔ پہلی بار اسلام کی فوجوں نے 36ھ میں قدیم شہر بست پر حملہ کیا اور پھر کابل کا رخ کیا۔ اس ڈویژن کے کمانڈروں میں سے ایک لیث بن قیس ابن عباس تھے جنہوں نے فوج

کے ایک حصے کی قیادت کی۔ کابل کی اونچی اور مضبوط دیواروں کو عبور کرنے کے بعد فوج نے کابل میں ایک شدید جنگ لڑی جس کے دوران "لیث" شہید ہوئے اور اسی جگہ دفن کیا گیا جسے اب "شاہ دو شمشیرہ مسجد" کہا جاتا ہے۔ اس مسجد اور مزار کو "شاہ دو شمشیرہ" کا نام دینے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب "لیث بن قیس" کابل میں داخل ہوا تو اس نے دو تلواریں لڑیں اور اسی وجہ سے اس مزار کا نام "شاہ دو شمشیرہ" رکھا گیا۔ شاہ دو شمشیرہ کے مزار نے کئی اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں، یہ سائٹ کئی بار تباہ ہوئی تھی، لیکن آخری بار ملکہ شام نے تعمیر کی تھی جو جدید افغانستان کی تاریخ کے پہلے بادشاہ امان اللہ خان کی اہلیہ تھی۔ "شاہ دو شمشیرہ مسجد" افغانستان میں تعمیراتی ثقافت کی علامت ہے اور پچھلی دو صدیوں کی تعمیراتی خوبصورتی کی عکاسی کرتی ہے۔ مزار کے ارد گرد بے شمار سفید کبوتر دیکھے جاسکتے ہیں جو کہ اس کی بیرونی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ مسجد کا خوبصورت نظارہ اور دریائے کابل کے کنارے اس کا مقام، مزار کی قدیمیت اور اس کے اہم مقام کی وجہ سے ملکی اور غیر ملکی زائرین میں اضافہ کرتا آیا ہے۔ مغرب نماز ہم نے شاہ دو شمشیرہ کے مسجد میں ادا کی اور نصیب اللہ جان کے معیت میں واپس ریشخور کے علاقے میں واقع ان کے گھر گئے اور وہیں رات بسر کی۔

21 جنوری 2023ء کو صبح ناشتہ کے بعد کابل کے پرانے بازار وغیرہ دیکھنے نکلے اور سینما پامیر بازار جو کابل کا قدیمی بازار ہے، میں کچھ خریداری کی اور سہ پہر کابل سے واپسی کا رخت سفر باندھ کر غزنی کا رخ کیا۔ غزنی مشرقی افغانستان کا ایک شہر ہے اسے غزنین، غزنہ، غزنو اور شہر اولیاء بھی کہا جاتا ہے جو صوبہ غزنی کا دارالحکومت ہے، غزنی افغانستان کا ایک اہم شہر ہے جو 962ء سے 1187ء تک سلطنت غزنویہ کا دارالحکومت تھا۔ یہ شاہراہوں کے ذریعے جنوب مغرب میں قلات، شمال مشرق میں کابل اور مشرق میں گردیز سے منسلک ہے۔ غزنی شہر کی آبادی کی اکثریت پشتون اور ہزارہ برادری پر مشتمل ہے۔ یہ شہر غزنی کے بادشاہوں کے عروج کے زمانے میں دارالخلافہ رہا ہے بالخصوص سلطان محمود غزنوی نے اس کی شہرت کو چار چاند لگادیے جس کی وجہ سے اسے حضرت غزنی کہا جاتا، اس دور میں یہ شہر قوت و شوکت اور اسلامی عظمت کا بے مثال نمونہ تھا۔ موجودہ غزنی سے شمال مشرق کو پانچ کلومیٹر دور قدیم غزنی کے کھنڈر موجود ہیں۔ غزنی شہر کے آثار آج بھی بڑی اچھی شکل میں موجود ہیں، جس طرح لاہور کا شاہی قلعہ اچھی شکل میں موجود ہے۔ اسی طرح غزنی کا قلعہ جس کے اندر شہر آباد تھا بڑی اچھی شکل میں موجود ہے۔ کئی بزرگان دین کے مزارات بھی یہاں پر موجود ہیں[15]۔ شہر میں کئی شاعر اور سائنسدانوں کے مزارات ہیں جن میں مشہور ترین ابوریحان البیرونی ہیں۔ غزنی کی قدیم عمارات میں 43 میٹر (140 فٹ) بلند دو برج باقی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مینار محمود غزنوی اور اس کے صاحبزادے نے تعمیر کرائے تھے۔ افغانستان کی خانہ جنگی میں کچھ شہر جن کو نقصان نہیں پہنچا ان میں سے ایک غزنی بھی ہے کیونکہ یہ شہر، شہر اولیاء ہے اور تمام افغانوں کے لیے یہ شہر افتخار کا باعث ہے اس وجہ سے یہ خانہ جنگی میں بھی محفوظ رہا۔ بہر حال کابل سے نکلتے ہوئے غزنی میں سید بہائی جان آغاؒ کے پڑپوتے سید جعفر آغا کو فون کرکے اپنے آنے سے آگاہ کیا، مغرب نماز کے بعد ان کے خانقاہ پہنچے، سید جعفر آغا اور سید عمر آغا نے مہمان نوازی کا حق ادا کیا، بہت ہی زیادہ اکرام کیا، رات دیر تک مختلف موضوعات زیر بحث رہے، کتابوں کے تحفہ سے بھی نوازا، اللہ تعالی اس گھرانے کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔

22 جنوری 2023ء کو صبح ناشتہ کے بعد سید بہائی جان آغاؒ کے گھر سے رخصت لیکر غزنی شہر میں حضرت بہلول داناؒ، حکیم سنائیؒ، موئی مبارک اور جمع صالحین کے زیارات گئے۔ حضور ﷺ کا موئی مبارک یہاں غزنی شہر میں موجود ہے اور انتہائی عقیدت و احترام سے محفوظ رکھا گیا

ہے، موئی مبارک کے زیارت اور درود پیش کرنے کے بعد جمع صالحین گئے۔ **جمع اولیاء**، اولیاء اللہ کے مجلس اور ذکر و مراقبہ کا مقام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غزنی اور ارد گرد کے تمام اولیاء اللہ اس مقام پر آکر اکٹھے ہوتے، یہیں ان کی مشاورت ہوتی اور ذکر و مراقبہ کے بعد ہر ایک ولی اپنے اپنے مقام کی طرف چلے جاتے۔ جمع صالحین کے نشست گاہ کے ساتھ ہی مسجد اور مدرسہ بھی تھا جہاں اس وقت طلبہ پڑھ رہے تھے۔ یہاں ایک اہم چیز جو دیکھنے کو ملا وہ اساتذہ کا طلبہ کو ملٹی میڈیا کے ذریعے پڑھانا اور سمجھانا تھا، یہ ایک مثبت تبدیلی اور جدید دور میں طلبہ کو عملی طور سمجھانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

حضرت بہلول دانا یا بہلول غزنوی کا نام شیخ زاھد الدین ہے[16]۔ آپؒ ایک ایسی شخصیت ہیں جس نے غزنی میں وقت گزارا ہے اور زاھد و عالم کی حیثیت سے لوگوں کی دلوں میں پیوستہ ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بہلول دانا کرامات اور روحانی اثر کی وجہ سے بہت سے پیروکار، مرید اور خلفاء رکھتے تھے۔ ان کے زندگی کے متعلق کوئی خاص معتمد معلومات موجود نہیں البتہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ بہلول دانا غزنوی دور سے بہت پہلے ایک متقی عالم و زاھد کے طور پر غزنی ہی میں رہتے تھے جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپؒ دیگر بہت سے شعراء کی طرح غزنوی دور کا ایک شاعر اور فاضل شخصیت ہیں، کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ بہلول دانا ویرانوں میں بے فکری اور دنیا سے بے خبر گھومنے والے شخص تھے اور ایسی باتیں کرتے جو بعد میں حقیقت بن جاتیں، مگر ان سب کے باوجود کوئی شخص ان کے حقیقی دستاویزی معلومات فراہم نہیں کر سکتا۔[17]

حکیم سنائی کا پورا نام ابو المجد بن آدم اور ان کا تخلص "سنائی تھا۔ سنائی 470ھ میں موجودہ افغانستان کے شہر غزنی میں پیدا ہوئے۔ حکیم سنائی ایک نہایت سادہ انسان تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی درویشی اور فقیری میں گزاری۔ انہیں سیر و سیاحت کا شوق تھا اور اسلامی حکومت کے زیر اثر مناطق کی سیر کرنے کے لیے نکلتے۔ حکیم سنائی کو مختلف علوم پر دسترس حاصل تھی جن میں تفسیر، حدیث، فقہ اور ادبی علوم شامل تھے۔ اس کے علاوہ وہ فلسفہ، ہندسہ اور علم طب میں بھی ماہر تھے۔ ایک حد تک وہ خواب کی تعبیر بتانے کا علم بھی جانتے تھے۔ حکیم کو ان کی اعلی علمی قابلیت اور ذہانت کے صلے میں مختلف القاب سے نوازا گیا، جن القاب سے انہیں نوازا گیا ان میں "حکیم" اور "شیخ" شامل ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے معروف اور ہر دلعزیز شخص تھے اور شعراء، عرفاء اور علما کی نظر میں انہیں نہایت اعلی مقام حاصل تھا۔ انہوں نے قصائد، غزلیات اور مثنویات پر طبع آزمائی کی۔ آپ کی مثنویوں کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی مشہور مثنویوں میں: حدیقۃ الحقیقہ، طریق التحقیق، سیر العباد الی المعاد، مثنوی کارنامہ، عقل نامہ اور عشق نامہ بہت معروف ہیں۔ حکیم سنائی ابو یوسف ہمدانی کے مرید تھے جب سنائی کو احساس ہوا کہ پست اخلاق اور بد اعمال کی مدح نہیں کرنی تو دنیا کی زندگی سے بیزار ہوئے اور زہد و تقوی و سلوک کی طرف مائل ہو گئے۔ یہی وہ دور تھا جب ان کی شاعری نے ایک نیا موڑ لیا۔ حکیم سنائی بہت ہی سادہ، واضح اور صریح انداز میں شاعری کیا کرتے تھے۔ ان کے کلام میں زلف، چشم بیمار، مے و میکدہ، رند و خرابات جیسی اصلاحات کو مضامین تصوّف میں استعمال کیا گیا ہے اور خیال یہ کیا جاتا ہے کہ شاید حکیم سنائی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے سب سے پہلے ایسی اصطلاحات کا استعمال مضامین تصوّف میں کیا۔ حکیم سنائی کی استادانہ مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ عطار اور مولانا روم جیسے عظیم شعراء نے حکیم سنائی کو اپنا پیشوا تسلیم کیا۔ حکیم سنائی اپنے کلام میں صوفیانہ اور قلندرانہ اصطلاحات کا استعمال عام طور پر کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے خیال کی تائید میں حکایت یا تمثیل لاتے۔ پند و موعظت کو سادہ اور عام فہم انداز میں پیش کیا کرتے جو لازمی طور پر قاری کو متاثر کر دیتا۔ حکیم سنائی غزنوی کا سال وفات 535ھ ہے۔

اس دوران فیس بک پر فرینڈ شپ بنانے والے دوست نجیب افغان سے رابطہ ہوا جنھوں نے ان زیارات کے لیے ہماری رہنمائی بھی کی اور آخر میں صرف چائے کے وعدے پر ہمیں اپنے گھر لے گئے لیکن وہاں چائے کیا تھی کہ ہر قسم کے نعمت خداوندی ہمارے سامنے موجود تھے، جب رخصت چاہا تو کھانے کا دستر خوان بچھادیا، ان کے بھائی محترم حبیب الرحمن تاثیر صاحب کے مجلس سے دل اٹھنے کو نہیں کر رہا تھا بہر حال اگلے ملاقات کے وعدے پر ان کے گھر سے کتابوں کے تحفے کے ساتھ رخصت ہو کر محترم مزمل ہوتک صاحب (نمائندہ ادارہ ثقافت و بیرونی مہمانان) کے معیت میں غزنی کتابتون / لائبریری اور ادارہ ثقافت کا دورہ بھی کیا، جہاں ادارہ ثقافت کے ڈائریکٹر مولوی عبد الحمید صاحب سے غزنی کے ثقافتی ورثے کے وسعت و حفاظت کے متعلق سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ غزنی سے نکل کر مقر کے علاقے میں میری ننھیال کے مشہور قلعہ "قلعہ کندھاری" (جس کے صرف نشانات و آثار باقی ہیں) آئے۔ یہاں پر زبردست برف باری شروع تھی، ڈرائیونگ کرنا مشکل تھا، اس سے آگے جھنڈا کے مقام پر آئے اور ایک رہبر (عصمت اللہ جو سید شمس الحق آغاؒ کے نواسہ تھے) کے رہنمائی میں "آغوجان" میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے چھوٹے بھائی نامور عالم و صوفی حضرت مولانا سید نور محمد آغاؒ عرف آغوجان صاحبؒ کے مرقد پر حاضری دی اور دعا کی، عصر کی نماز یہیں ان کے قدیمی مسجد میں ادا کی جہاں ایک عجیب کیفیت ہم پر طاری رہا، اتنی پسماندہ اور ویران علاقوں میں دین کی خدمت سرانجام دینے والے ایسی شخصیات پر رشک ہوتا ہے۔ (مولانا سید نور محمد آغاؒ عرف آغوجان صاحبؒ اپنے بڑے بھائی سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے خلیفہ مجاز تھے جبکہ میرے دادا سید خواجہ احمد آغاؒ نے اپنے چچا اور شیخ مولانا سید نور محمد آغاؒ عرف آغوجان صاحبؒ سے علم ظاہر و باطن میں استفادہ کیا تھا۔ آپؒ کا ایک بیٹا سید شمس الحق آغاؒ تھے جو آپؒ کے پہلو میں سپرد خاک ہیں) عصر نماز کے بعد ان کے پوتے سید احمد نور آغا کے ساتھ چائے نوشی کے بعد سید احمد نور آغا نے رات گزارنے کے لئے بہت اصرار کیا لیکن ہم نے رخصت لی اور واپس مین شاہراہ جھنڈا آئے، یہاں مغرب کی نماز ادا کر کے قلات کا رخ کیا اور رات 9 بجے کے قریب میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے دوسرے بھائی سید سیف الدین آغاؒ کے پوتے اور سید عصمت اللہ آغاؒ کے بیٹے سید محمد خیر آغا کے گھر پہنچے۔ پر تکلف عشائیہ سے خاطر مدارت کی اور رات یہیں پر گزاری۔ اسی دوران مجلس سید محمد خیر آغا کے پاس سے 1337 ھجری میں (107 سال قبل) حکمران افغانستان (دورہ سلطنت امیر حبیب اللہ خان 1901-1919) کی جانب سے ہمارے خاندان کو ملنے والا اعزازی و ٹیکس معافی خط بھی ملا، جس کی کاپی محفوظ کی۔

23 جنوری 2023ء کو سید محمد خیر آغا کے ساتھ ناشتہ کے بعد صوبہ ذابل کے مرکز قلات میں شہر سے تقریباً 15 کلومیٹر کے فاصلے پر میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کو اپنے والد صاحب مولانا سید محمد یار آتش نفسؒ سے وراثت میں ملنے والی جائیداد بنام شیرین کاریز (تقریباً 600 ایکڑ زرخیز زمین) دیکھنے گئے۔ یہ جائیداد اس وقت سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے تین بیٹوں سید محمد ابراھیم جان آغاؒ عرف آغا لالا، (میرے دادا) سید خواجہ احمد آغاؒ اور سید محمد نعیم آغاؒ کا حصہ ہے، جو اس وقت اکثریت ویران ہی تھا کیونکہ ہمارے خاندان میں سے کوئی وہاں موجود نہیں اور آس پاس لوگوں نے قبضہ جما کر کچھ آبادیاں کی تھیں۔

یہاں سے ہم واپس قلات شہر آئے، اور قلات شہر سے قندہار کی جانب نکل کر کوئی 16 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع علاقے "تنگی" پہنچے، یہاں ہمارے خاندان کا جائیدادی زرخیز زمین، گاؤں اور خاندانی قبرستان ہے۔ میرے پر دادا سید محمد موسی جان آغاؒ عرف لالا صاحبؒ کے تین بھائیوں سید میر احمد آغاؒ عرف حاجی لالاؒ، سید سیف الدین آغاؒ اور سید سرور جان آغاؒ عرف جلدک صاحبؒ کے مزارات ہیں۔ سید میر احمد آغاؒ

عرف حاجی لالاؒ کے دو بیٹے تھے سید محمد یعقوب آغاؒ اور سید محمد معصوم آغاؒ۔ سید میر احمد آغاؒ عرف حاجی لالاؒ بڑے ولی اللہ شخص تھے اور افغان شاہ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ ان کے مرید تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سید میر احمد آغاؒ عرف حاجی لالاؒ جب کبھی غصہ کے حالت میں ارگ (صدارتی محل) جاتے تو افغان شاہ نادر شاہ کو غصہ کی حالت میں "نادر گئی" کہہ کر پکارتے، یہ کسی توہین کی وجہ سے نہیں بلکہ ان پر زیادہ بھروسہ کی وجہ سے کہتے۔ سید سیف الدین آغاؒ کا ایک بیٹا تھا جو سید عصمت اللہ آغاؒ کے نام سے موسوم تھے، ان کا بیٹا سید محمد خیر آغا قلات میں آباد ہیں۔ جبکہ سید سرور جان آغاؒ عرف جلدک صاحبؒ کے ایک بیٹے تھے، سید محمد سلام جان آغاؒ۔ یہاں ظہر کی نماز ادا کر کے ہم نے قندھار کا رخ کرتے ہوئے عصر کو قندھار پہنچ کر سیدھا سلیمان جان کے بیکری پہنچے۔ اکل و نوش کے بعد مغرب کی آذان ہوئی لہذا مغرب نماز ادا کرنے کے بعد کچھ خریداری کے لئے قندھار شہر گئے اور خریداری کے بعد واپس عینومینہ گئے جہاں ہماری دعوت والد صاحب کے ننھیال کے حاجی جلات خان کے ہاں تھی۔ ان کے ساتھ کافی دیر تک گپ شپ کے بعد ہم نے ان سے رخصت لیکر سینومینہ میں ہی حاجی عبد اللہ صاحب کے گھر گئے جہاں عزیز اللہ جان سبز چائے تیار رکھے ہمارے آنے کا منتظر تھے۔ رات دیر تک ان کے ساتھ بھی گپ شپ رہی، اور پورے سفر کا روداد سنا کر رات دیر گئے بستر کو اپنالیا۔

24 جنوری 2023ء کو قندھار سے صبح 9 بجے بولدک بارڈر کے لیے روانہ ہوئے، بولدک بارڈر / ویش پہنچ کر حاجی عبد اللہ کی گاڑی واپس اسی منڈی میں پارک کی جہاں سے جاتے ہوئے ہم نے گاڑی لی تھی، ساتھ ہی حاجی عبد اللہ صاحب کو گاڑی پارک کرنے اور ان کا شکریہ ادا کرنے کیلئے وٹس اپ پر پیغام بھی بھیجا، جوابی میسج میں حاجی عبد اللہ صاحب نے کہا کہ ایک دن رک جاتے میں بھی کراچی سے چمن اور عصر تک بولدک بارڈر پہنچنے والا ہوں، لیکن چونکہ ہمارے دن زیادہ ہوگئے تھے اور ہم سفر در سفر میں ہونے کی وجہ سے کافی تھک چکے تھے لہذا اگلی بار کے ملاقات پر رخصت لیکر بولدک میں کچھ خریداری کے بعد بارڈر آئے، افغانستان کے پاسپورٹ پوائنٹ پر ان کا جاتے ہوئے دیا گیا پروفارما (جو استخبارات سے دستخط کروانا تھا) جمع کرنے کے بعد EXIT (خروج / تگ) کا سٹیمپ لگوا کر افغان سرزمین کو الوداع کہتے ہوئے پاک سرزمین میں قدم رکھا۔ یہاں ایک شرارت سوجھی، چونکہ ہم پاسپورٹ پر گئے تھے لہذا بارڈر پر ہم نے پاسپورٹ دکھائے بغیر جانے کی وضع بنائی، ایک دو پوائنٹ پر تو منت سماجت کر کے آگے نکلے لیکن جہاں پاسپورٹ / شناختی کارڈ یا تذکرہ دکھانے کا پوائنٹ آیا تو یہاں سختی بہت تھی، منت سماجت کام نہیں کر رہا تھا لہذا دھکم پھیل کر کے مجھے بھی ایک سائیڈ کر دیا اور یہاں پھر لین دین کا مرحلہ شروع ہوا، مرد / چھوٹے بڑے / بزرگ تو درکنار خواتین کے ساتھ بھی بڑی بدتمیزی جاری تھی، 3 سے 5 ہزار پر سودا طے ہو جاتا، یوں کوئی بھی شخص قانونی ڈاکومنٹس ہولڈر بن جاتا (کسی کے لیے کوئی معافی نہیں تھی) اور پھر پاسپورٹ / شناختی کارڈ یا تذکرہ دکھائے بغیر اگلے۔۔۔ کو آواز دی جاتی کہ بندہ کلیئر ہے جانے دیں، میں تو ڈھیٹ کھڑا بغیر کچھ دیئے جانے پر بضد تھا لہذا صاحب کو بھی غصہ آیا اور اگلے سے کہا کہ کھینچ کر مارو، میں سمجھا کہ اب خیر نہیں لہذا فوراً پاسپورٹ تھماتے ہوئے صاحب سے کہا کہ آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی تو ملک بدنام ہے، اپنا تعارف کرایا اور صاحب کو سوچ میں پڑا چھوڑ کر اپنے پاسپورٹ پر انٹری سٹیمپ لگوا کر آگے چلا، اور پھر کوئٹہ تک اسی سوچ میں تھا کہ واقعی یہ مملکت خداداد ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے چل رہا ہے ورنہ ہم نے تو اوپر سے لیکر نیچے تک کہیں بھی اس کا بیڑا غرق کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے اور تو کچھ بس میں نہیں تھا سوائے اس دعا کے کہ یا الہی پاکستان کی حفاظت فرما۔

حوالہ جات

[1] العنکبوت20:29

[2] الحج46:22

[3] Afghanistan, history–geography". Encyclopedia Britannica (بزبان انگریزی). اخذ شدہ بتاریخ19اکتوبر2018

[4] مائکروسوفٹ encarta.msn.com (Error: unknown archive URL), بذریعہ (Date missing) آرکائیو شدہ افغانستان انکارٹا انسائیکلوپیڈیا2006ءبزبان انگریزی

[5] https://www.globalresearch.ca/the-great-game-eurasia-and-the-history-of-war/7064 انگریزوں کی عظیم چالبازیاں

[6] https://en.wikipedia.org/wiki/Habibull%C4%81h_Kalak%C4%81ni حبیب اللہ کلاکانی۔انگریزی کتاب

[7] بی بی سی اردو۔https://www.bbc.com/urdu/regional-58482346

[8] علامہ محمد اقبال، مثنوی مسافر، پس چہ باید کرد،1936ء

[9] امیر عبد الرحمن خان 1880 تا1901تک افغانستان کے امیر تھے۔وہ محمد افضل خان کے تیسرے اور دوست محمد خان کے پوتے تھے۔امیر عبد الرحمن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے دوسری افغان انگریز جنگ کے بعد افغان حکومت کی رٹ بحال کی نیز انھیں آہنی امیر کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے جس کی وجہ قبائلی بغاوتوں کو کچلنے میں ان کی بے شمار کامیابیاں تھی۔

[10] امیر حبیب اللہ خان ،والئی افغانستان امیر عبد الرحمن کے بڑے بیٹے اور غازی امان اللہ خان کے والد تھے۔آپ نے 1901 سے لے کر1919تک افغانستان پر حکومت کی۔ان کے عہد میں انگریزوں نے افغانستان کی خارجی اور داخلی امور میں کامل آزادی تسلیم کرلی۔1905ء میں ہندوستان کا سفر کیا۔ اور اسلامیہ کالج لاہور کا سنگ بنیاد رکھا،کالج کا حبیبیہ ہال ان کے نام سے منسوب ہے۔ان کے زمانے میں افغانستان میں ڈاکٹری علاج شروع ہوا۔مغربی طرز کے مدرسے کھولے گئے اور پن بجلی گھر قائم ہوا۔

[11] سید بہائی جان آغا،نار نور، مکتبہ بنوریہ، میکانگی روڈ، کوئٹہ، اشاعت سوئم،1983ء، ص246

[12] Brockhaus Enzyklopädie online ID: https://brockhaus.de/ecs/enzy/article/mahmud-von-ghazni — بنام: Mahmud von Ghazni — اخذ شدہ بتاریخ:9اکتوبر2017

[13] ہندوستان کا تاریخی خاکہ، کارل مارکس وفریڈرک اینگلز،ترتیب وتعارف احمد سلیم، تخلیقات مزنگ روڈ،لاہور،2002ء، ص15

[14] Girardet, Edward; Jonathan Walter, eds. (1998). Afghanistan. Geneva: CROSSLINES Communications, Ltd. p. 291.

[15] ڈاکٹر شمس الدین، شرح کلام جامی، مشتاق بک کارنر،لاہور، ص15-11

[16] گل آغا احمدی وردگ، غزنی داسلامی تمدن پلازمینہ، کلیوال ادبی ملگری ټولنہ، غزنی،1394 شمسی، ص192

[17] ایضا، ص159